بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی حیات اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوعِ اسلام

دہلی

دورِ جدید

مدیر مسئول: حکیم ذکی احمد خاں
معاون: محمد عثمان

بدل اشتراک
پانچ روپیہ سالانہ
جلد ۱ بابت ماہ اگست ۱۹۳۸ء

فی پرچہ ۸ر
شمارہ ۲

فہرست مضامین

۱	شہادت رسالت	جناب اسد صاحب ملتانی	۴
۲	لمعات	مدیر	۵-۱۲
۳	مقام اقبال	جناب چودہری غلام احمد صاحب پرویز بی اے	۱۳-۳۱
۴	مشاعرہ بیادگار علامہ اقبالؒ	ادارہ	۳۲-۳۴
۵	فرنگی تمدن	علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ	۳۵
۶	تکلف برطرف	رازیؔ	۳۶-۳۹
۷	واردہا کی تعلیمی اسکیم	"	۴۱-۸۰
۸	رفتار زمانہ	ادارہ	۸۱-۸۸

شہادتِ رسالت

اَشْہَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہ

(اسد ملتانی)

ہے منتظرِ پرتوِ انوارِ الٰہی
ظلمت کدۂ ہند کی دیرینہ سیاہی

کیا راہ دکھائینگے ہم اوروں کو صد افسوس!
جب خود ہیں رہِ راست سے بھٹکے ہوئے راہی

نظروں میں رکھیں منزلِ مقصود کو ہر دم
کب دیتی ہے فرصت ہمیں آوارہ نگاہی

کیا اب بھی دکھا سکتے ہیں ہم کوئی نمونہ
شاہی میں جہاں فقر ہو اور فقر میں شاہی

ہو روئے زمیں کیلئے جو امن کا ضامن
کیا ہم بھی ہیں ایسے کسی لشکر کے سپاہی

کیا آج بھی غالب ہے تمدن میں ہمارے
انسان کے قانون پہ قانونِ الٰہی!

کیا ہم وہی ملت ہیں جو مطلوبِ خدا ہے
کیا ہم وہی امت ہیں محمدؐ نے جو چاہی

یہ بھی کبھی سوچا ہے کہ کس منہ سے اسدؔ ہم
دیتے ہیں محمدؐ کی رسالت پہ گواہی

لمعات

ماہ رواں کے آغاز میں پنجاب اسمبلی میں ہندو عورتوں کیلئے طلاق کا بل پیش ہوا اور ۱۳ کے مقابلے میں ۷۰ آراء سے اس بناء پر مسترد کر دیا گیا کہ مسودہ کی روح ہندو شاستروں کے خلاف ہے!

واقعات سے روز بروز ثابت ہوتا جا رہا ہے کہ ہندو مذہب انسانی فطرت کے قطعاً خلاف ہے۔ خصوصاً ہندو شاستر تو اس زمانہ کی یادگار ہیں۔ جب انسان نے انسانی فطرت کو شناخت کرنے کا ملکہ بھی پیدا نہیں کیا تھا اور انسانی ضرورتوں کا دائرہ بھی بہت تنگ اور مجہول تھا۔ مگر موجودہ زمانہ قدیم زمانہ سے بہت مختلف ہے۔ اور اس میں اسی قانون و دستور کو شرف قبولیت حاصل ہو سکتا ہے۔ جو عین فطرت انسانی کے مطابق ہو۔ اور یہ قانون سوائے قرآن کریم کے دنیا کو اور کہیں نہیں مل سکتا کہ باقی تمام دساتیر و آئین انسانی دماغ کی کاوشوں کے نتائج ہیں۔ اور قرآن کریم اس خدا کا قانون ہے جو حضرت انسان کا پیدا کرنیوالا ہے۔ ہندو عورتوں کیلئے مسودۂ طلاق کو اس بنا پر مسترد کر دینا کہ وہ شاستروں کے خلاف ہے قابل تسلیم ہے مگر سوال یہ ہے کہ شاستروں کو کب تک آڑ بنایا جائے گا اور ان قوانین کی کب تک پوجا کی جائے گی جو نہ جینیوں کے نزدیک مسلم ہیں نہ آریہ سماجیوں کے نزدیک قابل اعتناء اور نہ ہندوؤں کا تعلیم یافتہ طبقہ ان کے اقدام پر گردن جھکانے کیلئے تیار ہے۔ یوں تو بیواؤں کا عقد ثانی بھی شاستروں کے خلاف ہے۔ مگر خود ہندو ریاستوں میں اس کی حمایت میں قانون پاس ہو چکا ہے۔ اسی طرح قانون توریث بھی ویدوں اور شاستروں کے خلاف ہے۔ مگر ہندو اکابر اس کے لئے ایک ہمہ گیر قانون بنوانے کی سعی فرما رہے ہیں ہمارا ایکٹ شدھی کی تحریک اچھوتوں کو ہریجن بنانا ان میں کونسی چیز شاستروں کے مطابق تھی! اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ مسودۂ قانون طلاق کی مخالفت کے لئے شاستروں

کو بہانہ بنایا گیا ہے۔ ورنہ مقصد کچھ اور ہے اب یہ ہندو عورتوں کا فرض ہے کہ وہ اس رازدارانہ مقصد کا سراغ لگائیں اور فطرت کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے فیصلہ کریں کہ ان کیلئے صحیح راہ عمل کونسی ہے۔

عیسائیوں کی مجلس تبلیغ خارجہ نے اپنی طویل رپورٹ شائع کر دی ہے جس میں کرسچن فارن مشن کے کاموں پر تبصرہ کرتے ہوئے ان تبلیغی کاموں سے بحث کی گئی ہے جو مشرقی ممالک میں مشنریوں کے ذریعہ انجام پا رہے ہیں۔ رپورٹ میں مسلمانوں پر خصوصی توجہ مبذول کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اسلام کے مقابلے میں مسیحیت کا کامیاب ہونا کس قدر دشوار کام ہے۔ مشرق قریب کا ذکر کرتے ہوئے رپورٹ میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ

> کلیساؤں، مشنریوں اور ہر طرح کی مسلسل اور منظم کوشش کے ذریعہ مسلمانوں کو عیسائی بنانے کا کام جاری ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ ہمیں اس مقصد میں شاید ہی کامیابی ہوتی ہے۔ ورنہ ساری محنت رائگاں جاتی ہے ان حالات میں صرف یہی نہیں کہا جا سکتا کہ ہماری اتنی کوششوں کے باوجود عالم اسلامی؛ عالم اسلامی ہی ہے بلکہ ان علاقوں میں جتنے ہم کو مسلمان عیسائی بنانے کے لئے ملتے ہیں اس سے کئی گونہ زیادہ عیسائی مسلمان ہو جاتے ہیں!
> حالانکہ ہماری کوششیں منظم، ہمہ گیر اور اجتماعی ہوتی ہیں اور مسلمانوں کیطرف سے بجز غیر منظم انفرادی مساعی کے اور کچھ نہیں؛

یہ اعتراف کسی خوش عقیدہ عیسائی کا نہیں بلکہ اسلام کی اس دشمن جماعت کا ہے جو اپنے روپے اپنی سیاست اور اپنے مکر و فریب سے اسلام کو مٹا دینے پر تلی ہوئی ہے! کیا اس اعتراف کے ساتھ اس بات کا سراغ نہیں لگایا جائے گا۔ کہ اسلام کے مقابلہ میں یہ منظم اور اجتماعی قوتیں اور یہ ناقابل تسخیر قلعے کیوں بیت عنکبوت ثابت ہو رہے ہیں؟ تلوار تو تلوار

مسلمانوں کے پاس تو اب منظم اور اجتماعی قوت بھی نہیں ہے۔ پھر یہ انسان پرستی کا ستون کیوں اپنی جگہ سے ہل رہا ہے؟ ہمیں اسلام کی حقانیت کے احساس سے روحانی مسرت ضرور حاصل ہوتی ہے۔ مگر مسلمانوں کی غفلت سے ہمیں صدمہ بھی ہوتا ہے کہ اب تک شمع توحید کے مقابلے میں کفر کی تاریکیاں دنیا میں کیوں موجود ہیں!

مسلمانوں کو ہندی زبان سے کوئی بغض و عداوت نہیں ہے وہ جانتے ہیں کہ ہر زبان کو اپنے ماحول میں نشو و نما پانے کا موقعہ ملنا چاہیئے۔ انہیں ہندوؤں سے صرف یہی شکایت ہے کہ ہندی کی آڑ میں اردو کو تباہ کرنے کا خیال کیوں دماغوں میں پختہ کیا جا رہا ہے اور ان خامیوں پر کیوں نظر نہیں کی جاتی کہ جن کے باعث ہندی زبان مشترک زبان بننے کی صلاحیت سے محروم ہو چکی ہے۔

حال میں بنگال ایسوسی ایشن کانپور کے جنرل سیکریٹری نے اخبار "پانیر" میں ایک مکتوب شائع کرایا ہے جس میں یہ لکھنے کے بعد کہ ہائی اسکولوں کے امتحان میں صرف ہندی اور اردو میں جوابات لکھنے کو ضروری قرار دینا اور بنگالی زبان کو فراموش کر دینا بنگالیوں کی صریحاً حق تلفی ہے ہندی زبان کے متعلق یہ الفاظ تحریر فرمائے ہیں۔

> "اس سلسلہ میں ایک اور امر بھی قابل غور ہے ۳۶-۱۹۳۷ء کی اس صوبہ کی تعلیمی رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہائی اسکولوں میں ہندی کے ذریعہ مضامین کی تعلیم زبان مذکور میں کچھ قدرتی خامیوں کے باعث ایک دقت طلب تجربہ ثابت ہو رہی ہے۔" (کانفرنس گزٹ ۹ جولائی ۱۹۳۸ء)

یعنی ہندی میں ابھی اتنی بھی صلاحیت نہیں ہے کہ اعلیٰ تعلیم تو کجا ثانوی تعلیم کیلئے بھی "اپنی قدرتی خامیوں کے باعث" ذریعہ تعلیم بن سکے! مگر بنگالی صاحب کو شاید یہ معلوم نہیں کہ ہندوؤں کے سامنے صلاحیت اور عدم صلاحیت کا سوال نہیں ہے۔ بلکہ ان کا مقصد صرف

ایک ہے۔ یعنی ہر اس چیز کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دینا جو مسلمانوں کی طرف منسوب ہے یا جس کے ذریعہ ان کے بین الاقوامی اتحاد کا ثبوت مل سکتا ہے۔

فلسطین میں اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے وہ اخبار بین طبقہ پر پوشیدہ نہیں ہے۔ ۱۹۳۱ء میں عربوں پر جو مظالم ڈھائے گئے وہ ۱۹۳۳ء کے مظالم کے سامنے گرد ہو کر رہ گئے۔ ۱۹۳۶ء میں جس طرح عربوں کو چکی کے دوپاٹوں میں پیسا گیا اس نے سابقہ مظالم کی یاد دماغوں سے نکال دی۔ لیکن اس وقت ارض انبیاء میں جو قیامت برپا ہے۔ سیاسی اعتبار سے بھی اور مذہبی و معاشی اعتبار سے بھی اس نے فلسطین کے قدیم اور جدید واقعات دماغوں سے محو کر کے اسپین کی تاریخ دہرا دی ہے اور مسلمان حیران ہیں کہ کیا کریں۔ ایک مصیبت ہو تو برداشت کر لی جائے۔ وہاں تو مصائب کا ایک لامتناہی سلسلہ قائم ہے جو ختم ہونے ہی کو نہیں آتا۔ ایک طرف برطانیہ کے سیاسی مقاصد ہیں۔ حیفا بندرگاہ کی اہمیت ہے اور پورے عرب پر اقتدار قائم کرنے کا سوال ہے اور دوسری طرف یہودیوں کا قدیم تخیل "وطن یہود" پرورش پا رہا ہے۔ ان کا سرمایہ عربوں کے خون کی قیمت لگا رہا ہے اور سرزمین انبیاء کے لئے روز روشن میں سودا ہو رہا ہے! اس وقت وہاں جس قسم کے واقعات و حوادث درپیش ہیں ان کا صرف اعادہ ہی انسانیت کو لرزہ براندام بنا دیتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ آخر حکومت کے ارادے کیا ہیں وہ عربوں کو زندہ رکھنے پر رضامند ہے یا نہیں؟ اس نے اپنے مظالم کی کوئی حد بھی مقرر کی ہے یا اس کو بے لگام چھوڑ دیا ہے!

حقیقت یہ ہے کہ کسی قوم کی کلیتہ تباہی جو عجلت کے ساتھ ہو اس قدر درد انگیز نہیں ہوتی جس قدر وہ بربادی جو بتدریج ہو اور خود قوم بقائمی ہوش و حواس اپنی ہلاکت کا تماشہ دیکھے۔ فرعون لاکھ درجہ بہتر تھا کہ اس نے بنی اسرائیل کو معدوم کرنے کیلئے فوری ہلاکت کا طرز عمل اختیار کیا اور قوم کو اپنے اوپر ماتم کرنے کا موقعہ نہ دیا۔ مگر برطانیہ کی ہوس خون آشامی ظلم کے انتہائی نقطہ پر پہنچ چکی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ فلسطین کے عرب صرف برباد ہی نہ ہوں۔ بلکہ فنا ہونے سے

پہلے اپنی بربادی کا جی بھر کر تماشہ بھی دیکھ لیں۔ افسوس ہم عربوں کے ساتھ صرف زبانی ہمدردی کر سکتے ہیں۔ ان کی مظلومیت پر دو آنسو ٹپکا سکتے ہیں اور تھوڑی دیر کیلئے زبان ماتم سرا کو وقف کر سکتے ہیں۔ مگر برطانیہ کے قلب سیاہ کو سفید نہیں کر سکتے نہ ہم اپنا دل اس کے سینہ میں داخل کر سکتے ہیں۔ ؏ مجبوریاں بھی غیر کے ہیں اختیار میں۔ اللھم نجنا من القوم الظالمین

فیڈریشن کے بارے میں کانگریس کی نہیں بلکہ کانگریس کا جائزہ لینے والوں کی پوزیشن بہت نازک ہو گئی ہے اور عام خیال یہ ہے کہ انڈیا ایکٹ کی طرح " بادل ناخواستہ " فیڈریشن کو بھی قبول کر لیا جائے گا۔ اور "مکمل آزادی " کے خواب پریشان کی یہ تعبیر ہو گی۔ پنڈت جواہر لال نہرو ہندوستان میں۔ لارڈ لوتھین کی آمد سے پیشتر فیڈریشن کی جس طرح مخالفت کرتے تھے وہ لارڈ موصوف کی آمد کے بعد خفیف درجہ میں رہ گئی۔ یہ خفیف درجہ بھی کچھ اہمیت دمعنویت رکھتا تھا اور لوگوں کا خیال تھا کہ "ساحر فرنگ " کا افسوں زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکیگا۔ مگر دیکھنے والوں نے دیکھ لیا کہ انگلستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی یہ خفیف درجہ بھی صفر کے درجہ میں تحلیل ہو کر رہ گیا۔ کانگریس کے دائرہ میں مسٹر ستیہ مورتی کو جو درجہ حاصل ہے وہ سب پر عیاں ہے آپ نے فیڈریشن کے بارے میں اظہار خیال فرماتے ہوئے یہ اعلان کر دیا ہے کہ اگر اس میں چند ترمیمیں کر دی جائیں تو کانگریس کو چاہیئے کہ اسے قبول کر لے ! اگرچہ اس بیان پر صدر کانگریس سوبھاش بابو بہت چراغ پا ہیں بالکل اس طرح جیسے پنڈت جواہر لال نہرو وزارتوں کے قبول کرنے سے غضبناک تھے مگر نتیجہ یہ نکلا کہ خود جواہر لال نے انڈیا ایکٹ کو جلایا اور اس کو صبح و شام گالیاں بھی سناتے رہے اور سات صوبوں میں وزارتوں کے ذریعہ نافذ بھی کرتے رہے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہی حال فیڈریشن کا ہو گا۔ اس کو بھی صلواتیں سنائی جا رہی ہیں اور جب اسے قبول کر لیا جائے گا تب بھی صلواتیں سنائی جائیں گی گویا رد و قبول کے بیک وقت قبول کرنے کے فلسفہ کی عملی تشریح کی جائے گی۔

دہلی میں کسی واقف اسرار نے گذشتہ سرما میں کہا تھا کہ " مجھے یقین ہے کہ کانگریس فیڈریشن

کو قبول کرے گی۔ اب اس کے امکانات قریب نظر آرہے ہیں۔ ہمیں انتظار کرنا چاہیئے کہ انگلستان کو واپس آکر پنڈت جواہر لال نہرو فیڈریشن کی کیا تشریح کرتے ہیں۔ اور مسلمان قومیت پرست حضرات "انگریز کو ہندوستان سے نکال کر ممالک اسلامیہ کو آزاد کرانے" کے فریب میں کب تک خود بھی مبتلا رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی مبتلا رکھتے ہیں۔

ہدیہ تشکر و امتنان

ہر چند دائرہ طلوع اسلام کا ہر رکن اپنے اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں کچھ اس طرح منہمک ہے کہ نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی امید۔ لیکن بعض حضرات نے جس مجاہدانہ گرمجوشی سے اس پیغام کو عام کرنے میں اپنی اپنی جگہ مرکزی حیثیت سے اس خدمت کو اپنے ذمہ لیا ہے۔ بعید از سپاس گزاری ہوگا۔ اگر دائرہ کی طرف سے ان کا شکریہ نہ ادا کیا جائے۔ ان میں سے بہت سے حضرات تو ایسے ہیں کہ جب تک ان سے اجازت حاصل نہ کرلی جائے ان کے اسمار گرامی کا اعلان نہیں کیا جا سکتا لیکن کچھ ایسے بھی ہیں کہ ان کی عنایات جرأت بخش ہوئی ہیں کہ ہم ان کی اجازت کے بغیر ہی ان کی خدمت میں ہدیہ تشکر پیش کر دیں۔ مثلاً

(۱) جناب میجر نواب ملک ممتاز محمد خاں صاحب جہان آباد

(۲) جناب راجہ محمد اکبر خاں صاحب کیمبل پور۔

(۳) جناب شیخ فیض محمد صاحب۔ ایم۔ ایل۔ اے۔ ڈیرہ غازی خاں۔

(۴) جناب ملک برکت علی صاحب۔ ایم۔ ایل۔ اے۔ لاہور

(۵) جناب راجہ سرفراز خاں صاحب۔ ایم ایل۔ اے۔ چکوال

(۶) جناب چودھری نور خاں صاحب حلقہ دار۔ ضلع چکوال

(۷) جناب ملک محمد رشید صاحب سوجان پور

(۸) جناب راجہ فتح خاں صاحب۔ ایم۔ ایل۔ اے۔ مٹور (ضلع راولپنڈی)

(۹) جناب شیخ ممتاز حسین صاحب، حصار

اللھم انصر من نصر دین محمد واجعلنا منھم

اعتذار

ہم بکمال ندامت اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ باوجود کوشش کے رسالہ میں کتابت کی غلطیاں رہ جاتی رہی ہیں۔ سب سے زیادہ رنج اس امر کا ہے کہ جولائی کے پرچہ میں جو مضمون "گفتگوئے مصالحت" کے عنوان سے چھپا اس کی بہت سی زائد کاپیاں نکلوا کر پمفلٹ کی شکل میں شائع کی گئیں اس میں بھی کتابت کی بعض ایسی غلطیاں رہ گئی ہیں جو نفس مضمون پر اثر انداز ہو رہی ہیں۔ مثلاً رسالہ کے صفحہ کے زیریں حصہ میں لکھا ہے "(۲) پھر جس طرح اسلام کسی مسلم و غیر مسلم کی غیر مخلوط اجتماع کا تصور یکسر غیر قرآنی قرار دیتا ہے" اس میں "غیر مخلوط" کی جگہ "مخلوط" ہونا چاہیئے۔ ارباب علم سے امید ہے کہ وہ مضامین کے سیاق و سباق پر نظر رکھتے ہوئے صحیح الفاظ کے پہچاننے میں دقت نہ محسوس کریں گے۔ ہم ان حضرات کے ذوق سلیم سے اس فرد گذاشت کی معذرت چاہتے ہیں۔ اور انہیں یقین دلاتے ہیں کہ آیندہ سعی بلیغ کی جائے گی کہ بعونہ تعالیٰ رسالہ میں کتابت کی غلطیاں نہ رہیں۔

دوسری معذرت اس امر کی ہے کہ اس مرتبہ کتاب معارف القرآن کی قسط شائع نہیں ہو رہی۔ وار دھا اسکیم کے متعلق جو مضمون شائع ہو رہا ہے اس کی اہمیت کا تقاضا تھا کہ وہ اسی شرح و بسط سے لکھا جاتا اور ایک ہی قسط میں شائع ہوتا۔ اس کی وجہ سے بہت سے مضامین روک دینے پڑے۔ مختصر عنوانات بھی کم کرنے پڑے۔ اور معارف القرآن کے صفحات بھی رسالہ میں شامل کر لئے گئے۔ اس آخری چیز کا ہمیں دلی افسوس ہے کیونکہ جس شدت سے احباب کو اس کا انتظار رہتا ہے اس کا ہمیں خوب اندازہ ہے۔ انشاء اللہ کوشش کی جائے گی کہ اس کے بعد اس کی مسلسل اشاعت میں ناغہ نہ ہونے پائے واللہ المستعان۔

جولائی میں پنجاب اسمبلی کے اندر متعدد مسودات قانون پیش ہوئے جو مخالفت کے باوجود کثرت رائے سے منظور کر لئے گئے۔ ان مسودات میں جو اب قانون کی شکل اختیار کر چکے ہیں ساہوکارہ بل اور اراضی مرہونہ کی واگزاری کا بل خاص اہمیت رکھتے ہیں یوں تو ان بلوں کا منظور ہونا آئین و دستور کا ایک معمولی واقعہ ہے مگر مظلوم کسانوں اور کمر شکستہ مقروضوں کے دلوں سے پوچھو کہ انکے اندر زندگی اور بقا کا کتنا سامان پوشیدہ ہے۔ اور ان کی منظوری نے کس قدر خدا کی مخلوق کو برباد ہونے سے بچالیا ہے ہمیں افسوس ہے کہ ان بلوں کی مخالفت میں ان لوگوں نے ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگایا۔ جو پلیٹ فارموں پر گلے پھاڑ پھاڑ کر غریبوں کی غربت، مقروضوں کی ہلاکت اور کسانوں کی فاقہ کشی پر انتہا ہمدردی فرمایا کرتے ہیں۔ اگرچہ ۲۴ جولائی کو پنجاب کانگریس ورکنگ کونسل نے جملہ کانگریس کمیٹیوں اور کانگریسی کارکنوں کو ہدایت فرمادی تھی کہ وہ کاشتکاروں کے متعلق منظور شدہ مسودے ملے بل کی مخالفت میں کوئی حصہ نہ لیں (ہندوستان ٹائمز، مورخہ ۲۶ جولائی ۳۸ء صفحہ ۱۲) مگر ہم نے دیکھا کہ اسمبلی میں ان مفید بلوں کی مخالفت میں کانگریس پارٹی بھی اپنی "وسعت نظری" کا ثبوت دیئے بغیر نہ رہی اور کانگریسی نمایندے بلاواسطہ اور بالواسطہ بلوں کو مسترد کرانے کیلئے انتہائی کوشش کرتے رہے۔ بہرحال جہاں مخالفوں کی مخالفتیں عقل و نقل کی پابندیوں سے آزاد تھیں وہاں مقروضوں اور فاقہ کشوں کی دعائیں بھی بلوں کے شامل حال تھیں۔ چنانچہ وہ مخالفت کے علی الرغم منظور ہوئے اور پنجاب کی مہاجنی ذہنیت کو چیلنج دیدیا گیا۔ پنجاب گورنمنٹ مستحق تبریک ہے کہ اس نے مظلوموں کی دادرسی کا احساس کیا۔ اگر وہ ایک قدم اور آگے بڑھا کر پنجاب کو مہاجنی لعنت سے پاک کرنے میں کامیاب ہوگئی تو یہ انسانیت کی ایک ایسی خدمت ہوگی جو دستوری تاریخ میں آب زر سے لکھی جائے گی۔

مقامِ اقبال علیہ الرحمۃ

(۲۱ مئی کو دائرۂ طلوعِ اسلام کے زیر اہتمام صندل ہال شملہ میں حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کی یاد میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں چودھری غلام احمد صاحب پرویز نے مقامِ اقبال پر تقریر فرمائی۔ جو وہیں نوٹ کر لی گئی۔ تقریر کی جامعیت کے پیشِ نظر ہم اسے بکمال فخر طلوعِ اسلام میں شائع کرتے ہیں۔ (طلوعِ اسلام)

برادرانِ عزیز

وقت کی ضرورت اور احباب کے اصرار کا تقاضا تھا کہ یہ اجتماع آج سے بہت دن پہلے ہو جاتا۔ میں خود، اس اعتبار سے کہ مجھے حضرت علیہ الرحمۃ کے ادنیٰ ترین ارادتمندوں میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہے، اپنا یہ مقدس فریضہ سمجھتا تھا کہ میں آپ حضرات کی خدمت میں عرض کرتا کہ حضرت علامہؒ کا پیام اور اُن کا صحیح مقام کیا ہے لیکن حالت یہ تھی کہ دل سنبھالے سے سنبھلتا ہی نہ تھا۔ اسوقت بھی جب میں آپ کے سامنے حاضر ہوں، کیفیت یہ ہے کہ جب میں اس کا تصور کرتا ہوں کہ میں کون سی حدیثِ الم کی یاد تازہ کرنے کے لیے یہاں کھڑا ہوں تو آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے، جب کسی کے دل و دماغ کی حالت یہ ہو تو اس سے کسی تقریر کی کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا آج جو کچھ میں کہونگا اس کے متعلق یہی سمجھئے کہ ٹوٹے ہوئے دل کے کچھ ٹکڑے ہونگے جو الفاظ کی شکل میں آپ کے سامنے آ جائیں گے اور یہی وہ نذرِ عقیدت ہے جو میری چشمِ خونفشان حضرت علامہ کی بارگاہ میں بصد عجز و نیاز پیش کرنے کی جسارت کر سکتی ہے۔

میں ۲۰ اپریل کو یہاں آ گیا تھا۔ ۲۱ کی شام یکایک اطلاع ملی کہ حضرت علامہؒ انتقال فرما گئے

گذشتہ جنوری جب بتقریب یومِ اقبال میں لاہور گیا ہوں تو ۱ار جنوری کی صبح کو حضرت مولانا اسلم جیراجپوری، برادرم شیخ سراج الحق، محترمی حضرت اسد ملتانی اور مجی قاضی محمد اشرف صاحب کی معیت میں حضرتِ علامہؒ کی خدمتِ عالیہ میں شرف باریابی حاصل ہوا انسان کی زندگی میں بعض ساعتیں ایسی بھی آتی ہیں جسے وہ ماحصلِ زندگی سمجھتا ہے، وہ چند گھڑیاں جو اس مردِ حق آگاہؒ کی آخری صحبت میں ہمیں میسر آئیں، یقیناً ماحصلِ زندگی تھیں۔ اُسوقت بھی اُن کی طبیعت ہرچند ناساز تھی لیکن نہ ایسی کہ جس سے یہ گمان گزرے کہ ملتِ اسلامیہ پر یہ قیامت اتنی جلد ٹوٹ پڑنے والی ہے۔ اس کے بعد انکی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی۔ محترمی سید نذیر نیازی صاحب کے خطوط میرے دل میں دھڑکن پیدا کرتے تھے، لیکن میں متواتر اپنے دل کو فریب دیئے جاتا تھا کہ نہیں! طب ایک قیاسی علم ہے، اس کے فیصلے قابلِ اعتماد نہیں ہوا کرتے۔ دل کو یہ فریب کھائے جاتا اور رات کی تنہائیوں میں اُٹھ اُٹھ کر دعائیں مانگتا کہ اے اللہ اگر تیرا یہ قانون غیر متبدل ہے کہ کسی کی عمر گھٹ بڑھ نہیں سکتی۔ تو اتنا تو ہوسکتا ہے کہ کسی ایک کی عمر دوسرے کو دیدی جائے۔ اگر یہ ہوسکتا ہے تو اے مالکِ حقیقی میرے جیسے ناکارہ انسان کی ہزار عمریں اس ایک گراں مایہ عمر پر تصدق ہوں کہ جس کا ایک ایک لمحہ دُنیا کو حیاتِ جاودانی کا پیام دے رہا ہے۔ اے مولا! ملتِ اسلامیہ کی کس مپرسی دبیکسی کا واسطہ۔ اِس دلِ درد آشنا کو کچھ عرصہ کے لئے اور اذنِ تپیدن دے۔ اے چارہ سازِ بے چارگان! اُمتِ مسلمہ کی اس ٹوٹی ہوئی کشتی کو دیکھ اور اس گردابِ بلا کو دیکھ۔ صدقہ اپنے ترحمِ خسروانہ کا اس کشتی بان کو اتنی مہلت اور دیدے کہ یہ کشتی کسی ساحل پر جالگے۔ اے آقا! قومِ مسلم کے بکھرے ہوئے شیرازہ پر رحم کھا اور اس مرکزِ ملت کو پائندہ سے پائندہ تر کر دے یا الٰہ العالمین اس جرسِ کارواں کو اتنی دیر تک رخصتِ فغاں دے کہ یہ خوابیدہ قافلہ آمادۂ سفر ہوجائے۔ یہ دعائیں مانگتا اور ساتھ ہی سوچتا کہ اگر اطباء کے فیصلے محض ظنی اور قیاسی ہیں تو پھر یہ دل کی کشاکش کیسی جس کے لیے یوں دعائیں مانگی جارہی ہیں۔ یہ اضطراب کیوں جو دل کے نازک ترین گوشوں کی غیر محسوس لرزشِ پنہاں کو یوں بے نقاب کیئے جارہا ہے۔ تین ماہ سے اوپر قریب سو دن اور

سو راتیں اسی بیم ورجا۔ اسی یقین وفریب اپنی دُعاؤں اور اپنی التجاؤں میں گذر گئے۔ بالآخر فریب بے نقاب ہوگیا۔ حقیقت سامنے آگئی۔ طبیب سچے نکلے۔ میں بھی جھوٹا میری دُعائیں بھی غیر مستجاب۔ وہ کچھ ہو کے رہا جس کے ہونے کا تصور آتا تو دل ڈوبنے لگتا، آنکھیں پتھرا جاتیں۔ دماغ ماؤف ہو جاتا تمام کائنات سیاہ پوش نظر آتی، جس خبر کے خیال سے بھی روح میں کپکپی پیدا ہو جاتی وہ سُنی، اور خواب میں نہیں، عین بیداری میں سُنی۔ اور پورے حتم ویقین کے ساتھ سُنی۔ یَا لیتنی مِتُّ قَبلَ ھٰذا وَکُنتُ نَسیًا منسیًّا۔

قریبی اعزہ کی موتیں اپنی آنکھوں سے دیکھیں، کئی ایک احباب کو اپنے ہاتھوں سپرد خاک کیا۔ سینکڑوں ملنے والوں کی ماتم پرسی کی۔ تعزیت کے جلسوں میں شریک ہوا۔ موت کے فلسفہ پہ خطبے دیئے، مضامین لکھے لیکن اس خبر کے سننے سے وہ فلسفہ اور وہ منطق دھرے کے دھرے رہ گئے۔ ٹھہر اے چشمِ اشکبار، ٹھہر، کہ یہ رونا صرف آج کے لئے نہیں، یہ رونا تو اب باقی عمر کا سہارا ہے لیکن

درسینہ تا بچند بہ آرم، نفس دبرم۔ این نیم قطرہ خوں کہ زمژگاں چکیدنی ست

شام چھ بجے ریڈیو کے پاس آبیٹھا کہ کچھ تفصیلاً معلوم ہو سکیں، یہ پتہ پہلے ہی لیا جا چکا تھا کہ تجہیز و تکفین اسی شام ہو جائیگی۔ اور اس دور افتادہ محروم تمنا کو اس میں شمولیت کی سعادت بھی نصیب نہ ہوگی ریڈیو پر کان لگا کر بیٹھ گیا لیکن ــــ دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام۔ لاہور ریڈیو اسٹیشن والوں کو یہ کیونکر محسوس ہو کہ اُس وقت کتنے مضطرب و بیتاب قلوب تڑپ تڑپ کر باہر آرہے تھے کہ جو کچھ آنکھیں نہیں دیکھ سکیں، کان ہی سُن لیں، ریڈیو کا پروگرام پہلے سے مرتب ہوتا ہے اُسے اسی کے مطابق چلنا چاہیئے یہ کونسا ایسا واقعہ تھا جس کی خاطر دوسروں کی محفلِ رقص وسرود منغض کی جاتی۔ دہلی اور لکھنؤ کے سٹیشن کی مشینوں میں البتہ کچھ ایسا نظر آیا کہ لوہے کے پرزوں کی بجائے کہیں کہیں حساس قلوب بھی کام کر رہے ہیں، ہرچند وہ لاہور کے چشم دید حالات بیان نہ کرسکے لیکن انھوں نے کچھ خبریں اور بڑے بڑے لوگوں کے پیغامات تعزیت نشر کئے، لاہور سے بھی اخیر میں

پروفیسر تاثیرکی درد واثر میں ڈوبی ہوئی تقریر سُنائی گئی۔ ع

عمرت دراز باد کہ ایں ہم غنیمت است

اکابر ملت کے پیغامات سُنے، زعمائے وطن کے جذبات سے بھرے ہوئے کلمات تعزیت کان تو میں پہنچے، سیاسی مُدبرین، اربابِ حکومت۔ اہل قلم حضرات، شعرائے کرام، فلسفیوں، معلّمین، مصلحین، اپنے پرائے، ہر ایک نے مرنیوالے کی دماغی قابلیت، ذہنی ارتقا، خلق، مروّت، محبّت، تپاک، گرمجوشی۔ وسعتِ قلب، بلندنگہی، عالی ظرفی، کا اعتراف کرتے ہوئے خراج عقیدت پیش کیا سننے والے سُن رہے تھے اور حیران تھے کہ اسپر بھی مرحوم کو شکایت تھی کہ :۔

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں

لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ مرنے والا اپنی اس گلہ طرازی میں سچا تھا۔ بہت کم لوگوں نے پہچانا تھا کہ اقبال کیا ہے! وہ اپنی تنہائی کو محسوس کرنے میں حق بجانب تھا، اُسے عمر بھر ایک محرم کی تلاش رہی اور شاید یہ حسرت وہ اپنے ساتھ ہی لے گیا، جتنے پیغامات تعزیت تھے۔ انکا تجزیہ کیجئے تو سننے والا صرف اس نتیجہ پر پہنچ سکتا تھا کہ ہندوستان کا ایک شاعر وفات پاگیا ہے، دوسرے شاعر چھوٹے تھے، وہ ذرا بڑا شاعر تھا۔ اوروں کی شاعری ان کے گرد وپیش تک ہی محدود رہتی ہے اُس کی شاعری باہر کی دُنیا تک بھی پھیل گئی تھی، لیکن بایں ہمہ تھا وہ ایک شاعر ہی، اُردو اور فارسی کا بہت بڑا شاعر، زیادہ سے زیادہ ایک فلسفی شاعر، اقبال اس حقیقت سے ناواقف نہ تھا کہ لوگ اُسے بہت بڑا شاعر سمجھتے ہیں، اس بات کے علم کے باوجود اُس نے کہا تھا کہ "کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں" نہیں! بلکہ میں تو کہونگا کہ اس حقیقت کے سمجھ لینے کے بعد کہ دُنیا اُسے کیا سمجھتی ہے۔ اُسنے ایسا کہا تھا کہ "کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں" اور وہ سچا تھا! اقبال پر یہ بہت بڑا ظلم ہے کہ اُسے محض ایک شاعر ہی سمجھا جائے اقبال کا مقام اس سے کہیں بلند ہے، محض ایک شاعر کی حیثیت سے اس کی تعریف کرنا اُسے اُس کے مرتبہ سے بہت نیچے گرا دینا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانیت کی یہ بہت بڑی بدبختی ہے کہ بالعموم دنیا

کو مقصود بالذات سمجھ لیا جاتا ہے، محسوسات کی خوگر انسان کی نگاہیں جب لطیف حقیقتوں کے حسنِ بسیط سے پورے طور پر بہرہ یاب نہیں ہوسکتیں تو وہ پردہ ہائے مجاز کی ان رنگینیوں میں جذب ہو کے رہ جاتی ہیں جو اس حقیقت کو مشہود بنائے ہوئے ہوتی ہیں، شاعری دراصل وہ حسین و جمیل نقاب تھی جس کے اندر حقیقی اقبال چھپا بیٹھا تھا۔ لوگ آتے تھے اور ان پردوں کے نقش و نگار میں محو تماشا ہو کر رہ جاتے تھے۔ ان پردوں کے اندر بیٹھا ہوا اقبال کبھی ان ظاہر بیں نگاہوں کی فریب خوردگی پر ہنس دیتا، اور کبھی۔ جب اسے تنہائی ستاتی تو ایک ٹھنڈی سانس کے ساتھ گھبرا کر کہہ دیتا کہ کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں۔ ملتِ اسلامیہ کو آج نہ ایک شاعر کی موت سے کچھ نقصان پہونچا ہے نہ ایک فلاسفر کے چھن جانے سے۔ لاکھوں شاعر آئے، اور چلے گئے، ہزاروں فیلسوف پیدا ہوئے اور مر گئے، زیادہ سے زیادہ اتنا ہوا کہ کسی نے قوم کی متاعِ علمی میں کچھ اضافہ کر دیا، کسی نے ذہنی تکاپو دماغی کاوش کے لئے کچھ سامانِ غور و تدبر بہم پہونچا دیا۔ لیکن یہ کون سی ایسی گراں بہا متاع ہے جس کے لٹ جانے سے تمام دنیائے اسلام یوں صفِ ماتم بچھا کر بیٹھ جائے۔ نہ جاننے والے اسی کو ہی ماحصلِ زندگی سمجھ کر آج یوں سر بزانو بیٹھے ہیں۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ اقبال کے قلب کی حرکت بند ہو جانے سے ملتِ اسلامیہ کے قلب کی حرکت رک گئی۔ یہ ہے وہ قیامتِ صغریٰ جس پر صدیوں تک ہر رونے والی آنکھ روئے گی اور ہر تڑپنے والا دل تڑپے گا۔

ہاں! تو اگر اقبال محض ایک شاعر ہی نہ تھا تو اور کیا تھا! اس کے جواب میں سینکڑوں کتابیں لکھی جائیں گی اور ہزاروں عمریں صرف ہوں گی۔ پھر کہیں جا کر سمجھ میں آسکے گا کہ اقبال کیا تھا، لیکن یقین مانئے حقیقی اقبال کی جھلک کچھ وہی دیکھ سکے گا۔ جس کے سامنے قرآن کریم کھلا ہو۔ جس کی نگاہیں ایک طرف خدا کے اس آخری پیغام کی زندہ حقیقتوں پر ہوں اور دوسری طرف ان حقیقتوں کے محرمِ راز حضرت علامہ اعلی اللہ مقامہ کے حیات بخش کلام پر۔ وہ اور صرف وہ بتا سکے گا کہ اقبال کا صحیح مقام کونسا ہے۔ مسلمانوں نے قرآن کریم کے الفاظ کو یقیناً یاد رکھا

اور ایسا یا در کھا کہ دنیا کی کوئی قوم اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے قرآن کے معانی کو جس انداز سے بھلایا اس کی نظیر بھی شاید ہی کہیں ملے۔ صدر اول کے واقف اسرار، سراپائیں۔ مسلمانوں کے بعد قرآن نگاہوں سے اوجھل ہونا شروع ہوا اور رفتہ رفتہ وہ غیر اسلامی تصورات کے غلافوں میں یوں چھپ گیا۔ جیسے چاند گہن میں آجائے۔ صدیاں اسی کیفیت میں گذر گئیں اور پھر حالت یہ ہوگئی کہ یہی غیر اسلامی تخیلات عین اسلامی بن گئے اب مسلمانوں سے ان معتقدات کا چھڑانا گویا ان کی نگاہ میں انہیں دین سے بیگانہ بنا دینا تھا۔ ادھر یہ حالت تھی۔ اُدھر یورپ کی مادہ پرستی کے بڑھتے ہوئے سیلاب نے نوجوان طبقہ کے دل دماغ کو مذہبی اثرات کو خس وخاشاک کی طرح بہا کر لے جانا شروع کر دیا اور اس طرح ان کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا۔ مذہب پرست طبقہ اپنی جگہ نوحہ کناں تھا کہ نوجوان طبقہ مذہب سے بیگانہ ہی نہیں بلکہ متنفر ہوتا جا رہا ہے اور نوجوان طبقہ شکوہ سنج تھا کہ جس چیز کو ان کے سامنے حقیقت وبصیرت کہکر پیش کیا جا رہا ہے۔ اس سے ان کی فطرت اِبا کرتی ہے۔ غرضیکہ مسجدیں مرثیہ خواں تھیں کہ نمازی نہ رہے۔ اور بے نمازوں کو شکایت تھی کہ نمازیوں میں وہ صاحب اوصاف حجازی نہ رہے۔ مذہب کے مدعیوں کو ہر مقام پر شکست ملتی تھی اس لئے کہ قرآن کریم میں تو یہ جوہر موجود تھا کہ انسان علم وبصیرت کی جن بلندیوں تک چاہے اڑ کر چلا جائے۔ وہ وہاں سے بھی آگے ہی آگے نظر آئے۔ لیکن جن عجمی تصورات کو قرآن سمجھ کر پیش کیا جا رہا تھا وہ تو انسانی دماغوں کی کاوش کا ہی نتیجہ تھے ان میں یہ صلاحیت کیسے پیدا ہوسکتی تھی کہ وہ بڑھتے ہوئے زمانہ کا ساتھ دے سکتے غرضیکہ دنیائے اسلام ایک عجیب پیچ وتاب میں تھی کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ ہر حساس نگاہ رہ رہ کر آسمان کی طرف اٹھتی تھی کہ یا اللہ! تیرے اس آخری پیغام کا کیا انجام ہونے والا ہے کہ رحمت ایزدی نے اپنے بندوں کی کس مپرسی پر ترس کھایا اور ان میں ایک ایسی گراں مایہ ہستی کو پیدا کر دیا جس کی نگہ دور رس نے انسانی تخیلات کے تو بر تو پردوں کو قرآن کریم سے ہٹا کر عروس حقیقت کو بے نقاب دیکھ لیا۔ اور وہ اسلام جو مدت ہائے دراز

سے عجمی افسانوں کی وجہ سے چیستان بن چکا تھا۔ پھر اسے اپنی فطری حالت میں پہچانا گیا فطرت کی کرم گستری سے اس ہستی کو دماغ ایسا عطا ہوا جو علم و حکمت کے بلند ترین مقامات پر پہنچ چکا تھا اور اس کے ساتھ قرآن اور صاحب قرآن صلعم کی محبت نے اس کے سینہ میں وہ قلب منور رکھ دیا جسے صہبائے ایمان کا مقدس آبگینہ کہنا چاہیئے ان دونوں کے امتزاج سے وہ نگاہ پیدا ہوئی جو ہزار پردوں میں چھپی ہوئی حقیقت کو بھی بے نقاب دیکھ لے۔ اس نگہ حقیقت شناس کا نام ہے۔ اقبال۔

جب سے مسلمانوں میں مرکزیت فنا ہوئی تھی ان کے ہاں بھی دین اور دنیا دو الگ الگ شعبے قائم ہو چکے تھے جس طرح عیسائیت میں کلیسا اور سلطنت تھی۔ ہندوستان میں گرہست آشرم اور سنیاس آشرم تھا۔ مسلمانوں کے نزدیک بھی دنیا ایسی قابل نفرت شے ہو چکی تھی کہ ہر ممبر سے پہلی آواز یہ اٹھتی تھی کہ طالب دنیا مردود۔ طالب عقبیٰ محمود۔ اقبال نے آکر بتایا کہ اسلام کے متعلق یہ نظریہ یکسر غیر اسلامی ہے۔ قرآن کریم کی رو سے دین وہ ہے جو مسلمانوں کے سامنے ایک مکمل دستور حیات پیش کرتا ہے۔ ایک نظام زندگی مرتب کر کے دیتا ہے جو ان کی ہر قدم پر رہنمائی کرتا ہے۔ سیاست مدنیت، عمرانیت، معیشت، معاشرت سب دین ہی کی شاخیں ہیں۔ دنیا کا ہر وہ کام جس کی بنا تقوٰی پر ہو عین دین ہے۔ اور دین کا ہر وہ عمل جو ایک "رسم" بن کے رہ جائے عرف عام کے مطابق "دنیا" بن جاتا ہے۔ پھر اقبال نے محض یہ نظریہ ہی پیش نہیں کیا بلکہ انہوں نے تمام مسائل حیات کا حل قرآن کریم کی روشنی میں تلاش کیا اور مسلمانوں کے سامنے پیش کر دیا۔ اور جو نئی تحریک جو نیا مسئلہ پیدا ہوا اس کے متعلق بتا دیا کہ اسلام کا اس باب میں کیا حکم ہو سکتا ہے۔

پھر دین کے متعلق یہ غلط نظریہ رائج ہو چکا تھا کہ اس سے مقصود محض انفرادی نجات ہے، یعنی ہر فرد کی یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ کسی نہ کسی طرح اس کی اپنی نجات ہو جائے۔ ملت کے اجتماعی معاملات "دنیا داروں" کے لئے رہیں۔ یہ تھی رہبانیت کا تصور تھا جو مسلمانوں کے رگ و پے

میں سرایت کر چکا تھا۔ اقبال نے آکر بتایا کہ یہ انفرادیت کی زندگی کبھی اسلامی زندگی نہیں ہوسکتی قرآن کریم تو ایک ایسا نظام زندگی پیش کرتا ہے جس کی رو سے ہر فرد جماعت یا ملت کا ایک زندہ رکن ہے انفرادی اصلاح اس لئے ضروری ہے کہ ان افراد کے مجموعہ سے جو قوم بنے وہ از خود اصلاح یافتہ قوم بن جائے۔ لیکن اگر افراد کے سامنے اجتماعیت کی زندگی کا تصور نہیں تو وہ لاکھ اصلاح یافتہ ہوں مقصد زندگی سے بہت دور ہوں گے۔ فرد جب تک اپنے آپ کو ملت کے اندر جذب نہیں کر دیتا کبھی اسلامی زندگی بسر نہیں کرسکتا۔ اسلام جماعت ہے اور جماعت نام ہے ایک نظام کے ماتحت زندگی بسر کرنے کا۔ یہ نظام مرکز سے قائم ہوتا ہے اور مرکز ملت وہ امام متفق علیہ ہے۔ وہ امیر ہے جس کی اطاعت عین خدا اور رسولؐ کی اطاعت ہو جاتی ہے

پھر دین کے متعلق یہ تصور ذہنوں میں جاگزین ہو چکا تھا کہ عبادت و اعمال کے نتائج محض اخروی زندگی میں جاکر مرتب ہوں گے۔ ثواب نام رہ گیا تھا ایک ایسے نظریے کا جس کی کوئی محسوس توجیہہ اس دنیا کی زندگی میں نہیں ہوسکتی تھی اس غلط نظریے کی تخلیق کا سبب یہ تھا کہ جب اسلامی مرکزیت تباہ ہوئی تو اعمال انفرادی رہ گئے۔ اسلامی اعمال و عبادات اپنے صحیح نتائج اسی وقت پیدا کرتے ہیں جب وہ ایک اجتماعی نظام کے اندر رہ کر کئے جائیں۔ جب کوئی پرزہ ایک مشینری کے اندر اپنی جگہ پر ٹھیک فِٹ ہوگا تو اس کی ہر حرکت۔ جو باقی پرزوں پر بھی اثر انداز ہوگی۔ ایک نتیجہ مرتب کرے گی۔ لیکن وہی پرزہ اگر کہیں الگ پڑا ہو تو وہ لاکھ گھومتا رہے کوئی محسوس نتیجہ پیدا نہیں کرے گا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اعمال حیات جو انفرادی حیثیت اختیار کر چکے تھے وہ نتائج مرتب نہیں کرتے تھے۔ جو قرن اولیٰ کے مسلمانوںؓ کے اعمال سے مرتب ہوتے تھے لوگ اعمال و اشغال میں منہمک رہتے تھے لیکن ان سے نتائج ایسے برآمد نہیں ہوتے تھے جو ان کی دنیاوی زندگی کی زبوں حالی کو سربلندی و سرفرازی میں بدل دیں اُس وقت اگر نصیبہ یاوری کرتا تو یہ حقیقت سامنے آجاتی کہ چونکہ اجتماعی نظام فنا ہو چکا ہے اس لئے یہ اعمال صحیح نتائج مرتب نہیں کرسکتے

ان کے بار آور ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پھر سے وہی نظام قائم کیا جائے لیکن چونکہ مسلمانوں کے عذاب کی مدت اتنی جلدی ختم نہیں ہونے والی تھی۔ اس لئے بالعموم یہ سمجھ لیا گیا کہ دینی اعمال کا دنیاوی زندگی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ان کے نتائج بعد کی زندگی میں ہی مرتب ہوں گے۔ اقبال نے آکر بتایا کہ اعمال صالحہ سے مفہوم یہ ہے کہ وہ انسان میں یہ صلاحیت پیدا کر دیں کہ وہ موجودہ دنیاوی زندگی میں عزت و وقار، شوکت و حشمت، دولت و ثروت، حکومت و سلطنت کی زندگی بسر کرے اس کے بعد کی زندگی میں وہ تمام کامیابیاں نصیب ہوں جو قرآن کریم میں مذکور ہیں۔ اعمال و عبادات اگر ایسے جیتے جاگتے نتائج مرتب نہیں کرتے تو سمجھ لیجئے کہ اس طریقہ کار میں کہیں نہ کہیں نقص موجود ہے۔ وہ نقص یہ ہے کہ آج وہ نظام زندگی گم ہے جس کے اندر رہتے ہوئے یہ اعمال حقیقی معنوں میں اعمال صالحہ بنتے تھے۔

پھر مذہب کے متعلق یہ عقیدہ پیدا ہو چکا تھا کہ مذہب جتنا کچھ سمجھا جانا تھا سمجھا جا چکا۔ اس کے بعد کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ مذہب کے بارے میں مزید تحقیق و اجتہاد سے مسائل زندگی کا ایسا حل تلاش کرے جو زمانہ کی بڑھتی ہوئی ضروریات کا ساتھ دے سکے نتیجہ اسکا یہ ہوا کہ دنیا کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ مسلمان ایک ماضی پرست قوم بن کر زندگی کی دوڑ میں سینکڑوں برس پیچھے رہ گئے۔ اقبال نے ہمیں یہ بتایا کہ دین کے مکمل ہونے کے یہ معنے نہیں ہیں کہ اس کے متعلق سینکڑوں برس پیشتر اپنے ماحول کے ماتحت۔ جو کچھ کسی ایک عالم نے سمجھ لیا تھا وہ حرف آخریں ہے اور اس پر اضافہ یا ترمیم کفر و الحاد ہے۔ بلکہ اکملیت دین اور ختم نبوت کے معنی یہ ہیں کہ اصولی طور پر انسانی ضروریات کے لئے جو کچھ درکار تھا وہ سب کا سب قرآن کریم اور اسوۂ حسنہ کے اندر آ چکا اب ان اصولوں کی روشنی میں اپنے اپنے زمانہ کی ضروریات کے مطابق فروعی مسائل کا حل الگ الگ مستنبط ہوتا رہے گا۔ یورپ اس لئے تباہ ہوا کہ اس کے پاس مسائل حیات سے متعلق کوئی غیر متبدل اصولی قوانین نہ تھے۔ اور

مسلمان برباد ہوئے اس لئے کہ انہوں نے بدلتے رہنے والے فرعی مسائل حیات سے متعلق احکام کو بھی غیر متبدل سمجھ لیا۔ ماضی سے متمسک رہنا اس لئے ضروری ہے کہ جو سرمایہ علمی ہمارے بزرگ ہمارے لئے چھوڑ گئے ہیں۔ اس کی مدد سے ہم اپنے مستقبل کو درخشندہ و تابناک بنالیں۔ نہ یہ کہ ماضی تو درخشندہ رہے اور مستقبل تاریک ہوتا چلا جائے اس باب میں ارباب ذوق کو حضرت علامہ کے خطبات کے مجموعہ (RECONSTRUCTION - OF RELIGIOUS THOUGHTS) کا مطالعہ کرنا چاہیئے جو اسلامی باب تحقیق واجتہاد میں اپنے انداز کی ایک ہی کتاب ہے اور جو ہماری بدقسمتی سے ہمارے لئے ابھی تک ایک کتاب مختوم (SEALED BOOK) کی حیثیت اختیار کئے ہوئے ہے۔

٭

ایک طرف تو انہوں نے مذہب پرست طبقہ کے سامنے دین سے متعلق وہ حقائق پیش کئے جن کی رو سے وہ اسلام جو ایک عرصہ سے متاع گم گشتہ ہو چکا تھا پھر سے آنکھوں کے سامنے آگیا۔ دوسری طرف انہوں نے یورپ کی مادہ پرستی کے سرکش طوفاں کو روکنے میں جہا شروع کیا۔ یورپ بزعم خویش۔ ہر نظریہ کو علم و عقل کی روشنی میں پرکھنے کا مدعی تھا۔ اور اس نظر فریب خوش آئند نظریہ کے ماتحت وہ مسلمانوں کے نوجوان تعلیمیافتہ طبقہ کو مذہب سے برگشتہ کئے جا رہا تھا۔ ہمارے مذہب پرست طبقہ کے پاس اس الحاد و بیدینی کا علاج سوائے فتویٰ کفر کے اور کچھ نہ تھا اس لئے کہ نبی اکرمؐ کا یہ ارشاد گرامی ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا تھا کہ دشمن کا مقابلہ اس قسم کے ہتھیاروں سے کرو جو اس کے پاس ہوں۔ اقبال حکمت و فلسفہ کی ان بلندیوں تک پہنچ چکا تھا کہ خود اہل یورپ اسے ائمہ فن میں سے تسلیم کرتے تھے۔ ان ہتھیاروں سے مسلح ہو کر اس نے قرآن کریم کو ہاتھ میں لیا۔ اور یورپ کی مادہ پرستی کی دھجیاں فضائے آسمانی میں بکھیرنی شروع کر دیں۔ انہوں نے بتا دیا کہ وہ دین فطرت جو قرآن کریم کی دفتین میں محفوظ ہے کس طرح عین علم و بصیرت ہے اور وہ ظن و قیاس جسے یورپ علم و بصیرت

سمجھ رہا ہے کس طرح عین جہل و ظلمت ہے۔ یورپ کی مادہ پرستی اس عقیدہ پر مبنی ہے کہ انسان کی موجودہ زندگی سلسلۂ ارتقا کی آخری کڑی ہے اس کے بعد فنا ہے۔ اخروی زندگی ایک واہمہ ہے۔ اقبال نے اسی نظریہ ارتقاء کے مسلمات کی رو سے اس حقیقت غلطی کو ثابت کر دیا کہ موجودہ زندگی سلسلۂ ارتقا کی آخری کڑی نہیں بلکہ ایک آنیوالی زندگی کا پیش خیمہ ہے زندگی ایک جوئے رواں ہے جو بڑھتی چلی جائے گی۔ اور بقاء للاصلح (SURVIVAL OF THE FITTEST) کے اٹل قوانین کے مطابق بقا اسی کو نصیب ہو گی جو اصلح ہوگا۔ اور اصلح وہی ہو سکتا ہے جس کے قلب و جوارح کے اعمال قرآن کریم کے مطابق ہوں اقبال نے اس اسلامی نظریۂ حیات کو علمی انکشافات کی روشنی میں پیش کر کے صرف یورپ کی مادہ پرستی کا ہی استہلاک نہیں کیا بلکہ تمام نوع انسانی پر اس کا احسان عظیم ہے کہ اس نے انسانیت کی قدر و قیمت کو بڑھا کر اس اوج ثریا پر پہنچا دیا کہ وہی انسان جو قلب کی حرکت بند ہو جانے کے بعد مٹی کا ایک تودہ بن کے رہ جاتا تھا۔ اب ایک ایسی حیات جاوداں کا مالک بن گیا کہ موت اس کے نزدیک شب تیرہ و تار کے بعد ایک نورانی صبح کے طلوع کا نام ہو گیا۔ اقبال نے دنیا کو اس باب میں اس راز سربستہ سے آگاہ کر دیا جو اس کی موجودہ زندگی کے آخری الفاظ تھے۔

"میں مسلمان ہوں۔ موت سے کیوں ڈروں۔ موت کا تو میں خندہ پیشانی سے استقبال کروں گا"

زندگی کے متعلق جب یہ نظریہ قائم ہو جائے تو ظاہر ہے کہ اس سے انسان کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس بھی زیادہ ہو جاتا ہے اور یہی وہ احساس ہے جس سے دنیا میں عدل و انصاف قائم رہ سکتا ہے۔

یورپ کے نظریہ مادہ پرستی نے ایک اور بھی ہلاکت آفریں خرابی پیدا کر رکھی ہے۔ مادہ پرستی کے معنی یہ ہیں کہ انسان ہر شے کی قدر و قیمت مادیت کی میزان سے ہی متعین کرتا ہے۔ جب کوئی

کمزور و ناتوان کسی صاحب قوت سے امداد کا طالب ہوتا ہے تو وہ سوچتا ہے کہ کاروباری زاویہ نگاہ سے (FROM BUSINESS POINT OF VIEW) اس غریب کی مدد کرنا اس کیلئے زیادہ منفعت بخش ہے یا اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھاکر ہڑپ کر جانا۔ وہ دنیا کے ہر معاملہ کو اس "کاروباری" میزان سے تولتا ہے اور جس شکل میں اسے منفعت نظر آتی ہے اسے بلا تامل اختیار کر لیتا ہے۔ یورپ کا جدید ضابطۂ اخلاق اس اساس پر مبنی ہے۔ اور آج دنیا جس جہنم سے گزر رہی ہے وہ اس اساس کا فطری نتیجہ ہے۔ اقبال نے آکر بتایا کہ یہ نظریۂ حیات ابلیسانہ مکر و فریب کا جال ہے۔ اخلاق کا وہی ضابطہ انسانیت کے امن و فلاح کا ضامن ہو سکتا ہے جو انسانوں سے بلند۔ جذبات سے مبرا۔ خود غرضی اور مصلحت کوشی سے منزہ کسی ہستی کا متعین فرمودہ ہو۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انسان وحی الٰہی کا محتاج ہوتا ہے۔ مدبرین یورپ کی تمام سیاسی بساط اقبال کی نگاہوں کے سامنے تھی جونہی کوئی مہرہ اپنی جگہ سے سرکتا وہ دیدہ ور فوراً بھانپ لیتا کہ یہ چال اب کس مصلحت اندیشی کے ماتحت چلی جا رہی ہے۔ اس لئے وہ للکارتا کہ ہوشیار رہنا بہیمیت و بربریت کا وہی گرگِ باراں دیدہ اب ناصح مشفق کا نقاب اوڑھ کر آرہا ہے۔ جن جن امور کے متعلق اقبال نے "پیش گوئیاں" کی تھیں۔ دنیا اس وقت ہنستی تھی کہ یہ دیوانہ کیا کہہ رہا ہے لیکن وقت آنے پر دنیا نے دیکھ لیا کہ دیوانہ تو خود وہی تھی۔ جسے وہ دیوانہ کہتی تھی اس کی "دیوانگی" پر ہزار عقلیں قربان تھیں۔

آج سے بیس برس پہلے جبکہ تمام دنیا کی نگاہیں لیگ آف نیشنز کی طرف لگ رہی تھیں اور دنیا سمجھ رہی تھی کہ بس اب انسانیت سے متعلق ہر مصیبت کا علاج ہمارے ہاتھ لگ گیا ہے۔ اس وقت اس جمعیت کو "کفن چوروں کی جماعت" کہنا اقبال ہی کی نگہ دوررس کا کام تھا۔ آج سے تیس سال بیشتر جبکہ تہذیب یورپ اپنی انتہائی بلندیوں پر مسرت کے جھولے جھول رہی تھی اس کے متعلق کہنا کہ۔

تمہاری تہذیب اپنے ہاتھوں سے آپ ہی خودکشی کرے گی۔

اسی دیدہ ور کی بصیرت کا نتیجہ تھا۔ آج سے اٹھارہ برس پہلے جس وقت ترکی کی لاش پر تمام یورپ کے گدھ منڈلا رہے تھے۔ یہ کہہ دیا کہ،

اگر عثمانیوں پر کوہ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

اسی مفکرِ اعظم کی نگاہِ دوررس کا کام تھا۔ اس قسم کی بیسیوں مثالیں آپ کو کلامِ اقبال سے مل سکیں گی۔

پھر مادہ پرستی کی لعنت سے ایک اور مصیبت شروع ہوتی ہے۔ چونکہ مادیت سے انسان کی نگاہیں ہمیشہ محسوسات میں گھری رہتی ہیں اس لئے انسانوں کی تقسیم محسوس حدود وقیود سے کی جاتی ہے۔ زبان، نسل رنگ، وطن کی تفریق سے انسانی جماعتوں کی تشکیل ہوتی ہے۔ یہ وہ جہالت کبریٰ ہے جو آج انسانیت کی امن سوزی کی سب سے بڑی ذمہ دار ہے۔ یہ تفریق اس وقت شروع ہوتی ہے جب یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ انسان جس چار دیواری کے اندر پیدا ہوا ہے اس کی باہر کی دنیا سے اسے کوئی قلبی واسطہ نہیں نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ انسانوں کی جماعتیں خونخوار بھیڑیوں کا گروہ بن جاتی ہیں کہ ایک بھٹ کا بھیڑیا دوسرے بھٹ کے بھیڑیئے کے خون کا پیاسا ہو جاتا ہے۔ اقبال نے آکر بتایا کہ تقسیم انسانیت، کس درجہ تنگ نظری پر مبنی ہے۔ اس نے ثابت کر دیا کہ حیات تمام انسانوں میں ایک مشترکہ جوہر ہے۔ تمام انسانوں کی تخلیق نفس واحد سے ہوئی ہے یہ گروہ بندیاں، یہ زبان، نسل، رنگ، وطن کی بنا پر اقوام کی تعمیر عہد جہالت کی یادگار ہیں۔ اتحاد و ائتلاف کی بنا شرفِ انسانیت اور اخوت بشری پر ہونی چاہیئے۔

جو انسان شرفِ انسانیت (تقویٰ) میں بڑھا ہوا ہے۔ وہی اکرم ہے۔ اور وہ تمام

انسان جن میں یہ نفسی قدر مشترک ہے ایک قوم کے افراد ہیں خواہ وہ کسی نسل کے انسان ہوں۔ کوئی زبان بولتے ہوں دنیا کے کسی حصہ میں رہتے ہوں۔ قوموں کی تشکیل اس نظریۂ زندگی سے ہونی چاہیئے جسے کفر و ایمان کا نظریہ کہتے ہیں نہ کہ نسلی اور وطنی حدود بندیوں کی رو سے۔ اس میں شبہ نہیں کہ آج مادہ پرست انسان کی خود غرضی اور جوع الارضی اس نظریہ کے قبول کرنے سے اسے روکتی ہے۔ اور بار بار روکتی ہے کہ اس کے قبول کرنے سے اس کے خود تراشیدہ بت ایک ایک کر کے ٹوٹ جاتے ہیں لیکن دنیا جب باہمی خونریزیوں اور فتنہ پردازیوں سے تھک جائے گی۔ اس کا شعور نفس بلند ہو جائے گا۔ تو وہ خود بخود تسلیم کرے گی کہ نوع انسانی کے مصائب کا حل فی الواقعہ اس نظریہ کے اندر ہے جو اس اسلامی مفکر نے پیش کیا تھا۔ وہ اسلامی مفکر جس نے اپنی موت سے کچھ ہی عرصہ پیشتر پوری قوت کے ساتھ اس چیز کا اعلان فرمایا کہ ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کے متعلق صرف وہی قانون قابل قبول ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے۔ اور ہر وہ آئین جو اس کے خلاف ہو یکسر نامعقول اور مردود ہے۔

یہ ہے ایک ہلکی سی جھلک حقیقی اقبال کی۔ وہ اقبال جو اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا تھا بلکہ ہر مسئلہ کا حل قرآن کریم کی روشنی میں تلاش کرتا تھا اور اس تلاش میں وہ کسی غیر کا منت کش نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ اس کا مسلک یہ تھا کہ

از تاک بادہ گیرم و در ساغر افگنم

سلہ میں نے "پیام اقبال اور قرآن کریم" پر پہلے ہی سے ایک سلسلہ مضامین شروع کیا ہوا ہے۔ اس کی پہلی کڑی گذشتہ یوم اقبال پر اپنی تقریر میں پیش کی تھی۔ اس تقریب کی یاد میں پھر ایک مفصل مقالہ بھی اس موضوع پر لکھا تھا جو انشر کا لجیٹ مسلم برادرہڈ کے پاس ہے جسے وہ مجموعۂ مضامین یوم اقبال میں شائع کر رہے ہیں۔ باقی کڑیاں اب انشاء اللہ بعد میں شائع ہوں گی۔

اس کی صہبائے بصیرت براہِ راست خمستانِ حجاز سے سربمہر آبگینوں میں آتی تھی۔ اقبال نے جب دعوی کیا تھا کہ

جہاں را جز بہ چشم خود نہ بینم

تو یہ محض شاعری ہی نہ تھی ایک حقیقت نفس الامری تھی۔ پھر فطرت کا کرم بالائے کرم کہ ان حقائق کے بیان کرنے کے لئے اسے ذریعہ ایسا حسین و دلکش عطا ہوا کہ جو دیکھے کھنچا ہوا چلا آئے۔ یہ ذریعہ تھا اقبال کی شاعری! اب غور فرمایئے کہ اقبال کو محض ایک شاعر ہی سمجھ لینا کچھ ایسا ہی ہے جیسا بلا تمثیل قرآن کریم کو محض ایک ادبی صحیفہ تصور کر لینا۔ جب اقبال کا صحیح مقام متعین کر لیا جائے تو پھر سمجھ میں آسکتا ہے کہ اقبال کو فطرت نے کس مقصد عظیم کے لئے پیدا کیا تھا۔ اور اس مقصد کو اس نے کس حد تک پورا کیا۔ وہ یہ سمجھانے کے لئے نہیں آیا تھا کہ زمینِ شعر میں گلکاریاں کس طرح کی جاتی ہیں بلکہ وہ یہ بتانے کے لئے آیا تھا کہ یہ زمین کس طرح بدل سکتی ہے۔ یہ آسمان کس طرح بدل سکتا ہے۔ اور مسلمانوں کو ان کی عظمت گم گشتہ پھر سے کس طرح مل سکتی ہے۔ پوچھا جائے گا کہ اقبال نے کام کیا کیا! یہ سوال پھر اس طبقہ کی طرف سے اٹھے گا۔ جس کی نگاہیں محسوسات میں الجھ کر رہ جاتی ہیں۔ وہ طبقہ جو اوجِ طالعِ لعل و گہر کی بجائے کسی کے جوہرِ طرفِ کلاہ " کی طرف دیکھتا ہے[1]۔ جو کسی کی عظمت کا اندازہ اس سے لگاتا ہے کہ اس نے اینٹوں اور پتھروں کا کتنا بڑا انبار جمع کیا تھا۔ وہ کسی کی شان و شوکت کے لئے یہ دیکھتے ہیں کہ اس کی گاڑی کو کتنے گھوڑے کھینچتے تھے۔ کتنے ہاتھی اس کے جلوس میں تھے۔ کتنا وسیع پنڈال اس کی آمد کی تقریب میں تعمیر ہوا تھا کتنے لاکھ انسان اس کے گرد و پیش "زندہ باد" کے نعرے لگاتے تھے جو لوگ کسی کے اعمالِ حیات کو ان میزانوں سے تولتے ہیں ان کے لئے اس سوال کا جواب بڑا مایوس کن ہوگا۔ لیکن جن کی نگاہیں محسوسات سے گذر کر حقائق کو پرکھتی ہیں وہ دیکھ سکتے ہیں کہ اقبال نے کیا کیا۔ کسی کی دنیا بدل لینے کے لئے یہ سہل ہے کہ اس کے مکان کا نقشہ

---

[1] تیرے جواہرِ طرفِ کلاہ کو کیا دیکھیں۔ ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں۔ غالب

بدل دیا جائے۔ ضرورت اس کی ہوتی ہے کہ اس کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا جائے۔ اس کا نظریۂ زندگی بدل دیا جائے کہ

اگر نگاہ تو دیگر شود جہاں دگر است

اقبال نے اپنے طریق کار میں اس روش کو اختیار کیا جو پیغمبروں کی تجویز فرمودہ ہوتی ہے۔ اور مقام محمد عربی کے ایک سچے شناسا کو کرنا بھی یہی چاہیئے تھا اقبال نے کشتی کا رخ بدلنے کی بجائے پانی کے دھارے کا رخ بدل دیا اس نے اشیاء کا رنگ تبدیل کرنے کی بجائے نگاہوں کی عینک کا رنگ بدل دیا۔ اس نے جسموں کو نہیں چھوا بلکہ دلوں کو بدل دیا اور یہ ظاہر ہے کہ دل کے بدل جانے سے دنیا بدلجاتی ہے۔ قرآن کریم کے اصول کے مطابق قوموں کی حالت بدلنے کے لئے ان کے "نفوس" کی حالت بدلنی ضروری ہوتی ہے۔ اقبال نے قوم کی نفسیاتی کیفیت کو بدل دیا اس نے مسلمان کو پھر سے اس کا بھلایا ہوا سبق یاد دلایا۔ اس نے ایک نیا دین "پیش کیا اور یہ "نیا دین" وہی "اصلی دین" تھا جو نبی اکرمؐ نے آج سے چودہ سو سال پیشتر اس جماعت کے سامنے پیش کیا تھا۔ جس جماعت نے انسانیت سے متعلق ہر باطل نظریہ کو بدل دیا اور دنیا کو بتا دیا کہ "خدا کی بادشاہت" سے کیا مفہوم ہے۔ اب کہئیے کہ اقبال نے کچھ کیا ہے کہ نہیں!

لیکن بایں ہمہ اقبال اپنی زندگی کے مشن کا محض ایک خاکہ تیار کر کے دے سکا۔ اس میں رنگ بھرنا باقی رہ گیا۔ ابھی اس نے بہت کچھ کرنا تھا لیکن اسے کچھ کرنے کی مہلت نہ دی گئی اور اس کی تمامتر ذمہ داری اس تیرہ بخت قوم کے سر عائد ہوتی ہے۔ جس میں وہ پیدا ہو گیا۔ وہ گوہر نایاب اس بازار میں آگیا۔ جہاں کوئی اس کی قدر و قیمت سے واقف نہ تھا۔ یہ تو نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کی عمر کا ایک لمحہ بڑھا دیا جا سکتا۔ لیکن یہ تو ہو سکتا تھا کہ اسے اتنی فرصت دیدی جاتی کہ وہ اپنا مشن پورا کر جاتا۔ اقبال گدا گر نہیں تھا اس کی خود داری نے کسی کا دست نگر ہونے کی بجائے موت کو ترجیح دی۔ لیکن جب اس نے اپنے دل و دماغ کی بہترین متاع قوم کے حوالہ

کردی تو کیا اس کے بدلے میں احسان شناسی کا تقاضا نہ تھا۔ کہ قوم اسے فکر معاش سے تو آزاد کر دیتی! اگر وہ اپنے اس دل و دماغ کو۔ اپنے لئے ۔صرف کرتا تو کیا وہ۔ ہنری فورڈ نہ بن جاتا! لیکن وہ اپنے لئے زندگی بسر کرنے کو نہیں آیا تھا۔ وہ دوسروں کی خاطر جینے اور دوسروں کو زندگی کا پیغام دینے کیلئے آیا تھا۔ وہ دوسروں کی خاطر جیا اور دوسروں کے خاطر ہی اس نے جان دیدی۔ لیکن اس جوہر ناشناس قوم کو مطلقا احساس نہ ہوا کہ خدا کی کتنی بڑی نعمت نایاب یوں ہاتھوں سے چھن رہی ہے اگر قوم اقبال کی قدر کرتی تو یہ خود اس کے اپنے فائدے میں تھا۔ عمر بھر اقبال کو تمنا رہی کہ اگر پانچ سات برس فراغت کے میسر آجائیں تو وہ یورپ کے کتب خانوں میں بیٹھکر قرآن کریم اور فقہ اسلامی سے متعلق دو کتابیں لکھدے۔ سمجھنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ اگر حضرت علامہؒ کی یہ تمنا پوری ہو جاتی تو وہ کیا چیزیں قوم کے لئے چھوڑ جاتے! اقبال نے اسی تمنا میں دنیا کو الوداع کہدیا اور حقائق کا گراں بہا خزانہ جو اس کے سینۂ پرنور میں محفوظ تھا نہ خاک مدفون ہو گیا۔ قوم اب انتظار کرے کہ پھر سے اقبال پیدا ہو اور ان دبے ہوئے خزانوں کو نکالے۔ لیکن اس سادہ لوح قوم کو کیا خبر کہ ایک اقبال پیدا کرنے کے لئے فطرت کو کون کون سے مراحل طے کرنے پڑتے ہیں

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ذرا قوم اپنی تاریخ پر نگاہ ڈال کر دیکھے تو سہی کہ اس سے پہلے کوئی اقبال کب پیدا ہوا تھا اور اس حساب سے خود ہی فیصلہ کرے کہ اب پھر کوئی اقبال کب پیدا ہوگا۔ سو رونا آج اقبال کی موت کا نہیں، رونا قوم کی بدنصیبی کا ہے۔ رونا اس کی شور بختی کا ہے۔ رونا اس بات کا ہے کہ اس کے عذاب کی مدت پتہ نہیں کب ختم ہوگی۔ اقبال تو اس بلند مقام پر پہنچ چکا تھا جو موت کی دسترس سے بالاتر ہے۔ وہ مرد مجاہد تھا۔ اس نے تمام عمر ایک مسلسل جہاد میں گذار دی اور اس میدان جہاد سے زندگی کی اگلی منزل کی طرف قدم بڑھا دیا۔ لہذا اقبال کو مردہ کون کہہ سکتا ہے۔ وہ زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء ولا کن لا تشعرون۔

مردہ تو ہے وہ قوم جو اس رازِ حیات کو نہ سمجھ سکی۔ آخری دنوں طبیبوں نے جب یہ فیصلہ دیدیا کہ اگر حضرت علامہؒ نے اپنے دل و دماغ کو اسی طرح مصروفِ کار رکھا تو زیادہ عرصہ تک ہم میں نہیں رہ سکیں گے۔ تو انہوں نے عملاً اس کا جواب وہی دیا جو وہ عمر بھر کہتے رہتے تھے کہ

حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

یہ سمجھکر کہ اب زیادہ عرصہ تک انہیں اس دنیا میں نہیں رہنا ہوگا وہ اور گرمجوشی اور ولولہ اندازی کے ساتھ مصروفِ مجاہدات ہوگئے۔ انہیں بیتابی تھی کہ جو کچھ میری نگاہوں نے دیکھا ہے آگے دوسروں کو بھی دکھاتا جاؤں۔ موت قریب آرہی تھی اور انہیں یہ فکر راتوں کو سونے نہ دیتی تھی کہ کس طرح اپنی قوم کو سمجھاؤں کہ وہ تباہی اور بربادی کے کن عمیق و مہیب غاروں کی طرف بڑھتی جارہی ہے۔ یہ فکر موت کو اور قریب تر کررہی تھی۔ اسی کشمکش میں اس شہید ملت نے پیکِ اجل کو نہایت خندہ پیشانی سے لبیک کہا۔ اور وہ آنکھیں جو حق و باطل کا فیصلہ ایک نگاہ میں کردیتی تھیں۔ ابدی نیند سوگئیں۔ وہ دل جو قوم کے درد میں سیماب وار تڑپتا رہتا تھا ہمیشہ کیلئے ساکت ہوگیا۔ نہیں! جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے۔ اقبال کے دل کی حرکت بند نہیں ہوئی بلکہ ملتِ اسلامیہ کے قلب کی حرکت بند ہوگئی۔ کہ نبضِ ملت میں تموج تھا تو اسی سے، جسدِ اسلامی میں زندگی تھی تو اس کے دم سے۔ روح اڑ گئی اور جسم باقی رہ گیا۔

اب اسے ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لیکر

جب سنتا ہوں کہ حضرت علامہؒ کے جنازہ کے ساتھ ہزاروں کا مجمع تھا۔ بڑے دھوم سے جلوس نکالا گیا تو دل کی ٹیس ایک عجیب سی ہنسی بن کر لب تک آتی ہے۔ وہی قوم جس نے جیتے جی کبھی پوچھا نہیں کہ یہ نادرۂ روزگار ہستی کس غم میں گھلی جارہی ہے۔ وہ آج اس کے غم میں یوں صفِ ماتم بچھا کر بیٹھ رہی ہے ع

"ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا"

لیکن فطرت کچھ ایسی ارزاں فروش واقع نہیں ہوئی کہ وہ ایک ایسی متاعِ گراں بہا

کا معاوضہ چند آنسو چند تعزیتی پیغام، اور چند ماتمی مظاہرے کافی سمجھ لے فطرت اپنے انتقام میں بڑی سخت گیر واقع ہوئی ہے ؎

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

اس جوہر بے بہا کی قدر ناشناسی سے قوم نے جس قدر اپنا نقصان کیا ہے اس کا کفارہ اب اس طرح ادا ہو سکتا ہے کہ اقبال جو پیغام چھوڑ گیا ہے اسے اپنی زندگی کا نصب العین بنایا جائے اور اس نورانی شمع کو ہاتھ میں لیکر دنیا سے ہر باطل کی تاریکی کو مٹا دیا جائے۔ تمہارے دلوں میں یاد ہو تو اقبال کی۔ تمہاری محفلوں میں چرچا ہو تو اقبال کا، تمہاری درسگاہوں میں تعلیم ہو تو پیام اقبال کی۔ تمہارے واعظ وعظ کہیں تو اس کا۔ تمہارے خطیب خطبہ دیں تو اس کا۔ اٹھو تو اقبال سامنے ہو۔ بیٹھو تو اقبال سامنے ہو۔ تمام عالم پیام اقبال سے گونج اٹھے اور اس طرح تمہاری خاک کے ذروں سے ایک نئی دنیا تعمیر ہو۔ اگر ایسا نہ کروگے تو یاد رکھو۔ اقبال تو زندہ ہے زندہ رہے گا۔ لیکن تم مٹ جاؤگے۔ اور ؏

تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

واردھا کی تعلیمی سکیم اور مسلمان

کا مضمون الگ پمفلٹ کی شکل میں بھی شائع کیا جا رہا ہے۔ مضمون کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ یہ پمفلٹ ہر صاحب درد و احساس مسلمان کے ہاتھ میں ہو ایک آنہ (ارنی نسخہ) اور پانچ روپیہ سینکڑہ کے حساب سے علاوہ محصول ڈاک، طلب فرمائیے۔ یہ قیمت ان بے شمار نسخوں کی لاگت کی کفیل ہو جائے گی جو طول و عرض ہند میں مناسب مقامات پر مفت تقسیم کئے جا رہے ہیں:

منیجر طلوع اسلام بلیماران دہلی

مشاعرہ بیادگار علّامہ اقبالؒ

(از ادارہ)

مجلس علم وادب دہلی کے زیر اہتمام ۲۴ر جولائی کی شب کو حضرتِ علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کی یادگار منانے کی تقریب میں ایک مشاعرہ ہوا جس کا اعلان ایک عرصہ سے ہو رہا تھا۔ ایک تو مشاعرہ بیادگار حضرت علامہؒ پھر مصرع طرح بھی انہی کا یہ مصرع :۔

خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری

ظاہر ہے کہ مشاعرہ کی نظموں اور غزلوں کو کس رنگ میں ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن یہ دیکھ کر کس قدر رنج ہوا کہ دنیا کہاں سے کہاں چلی گئی اور دہلی کی ابھی تک یہ حالت ہے کہ

وہی سنگِ در ہے وہی اپنا سر ہے۔

اول تو سوائے دو تین حضرات کے کسی نے یہ محسوس ہی نہیں کیا کہ مشاعرہ کس تقریب میں ہو رہا ہے وہی کنگھی چوٹی یہاں بھی تھی جو اور ہر جگہ ہوتی ہے۔ یہ مضمون تو قریب قریب ہر غزل میں "باندھا گیا" تھا کہ

خدا جانے میں کیا کہہ دوں نہ کھلواؤ زباں میری

لیکن بایں ہمہ "زبان کھولی جاتی تھی"۔ اور اس سے اس قسم کے اشعار حضرت علامہؒ کے حضور بطور نذر عقیدت پیش کیے جاتے تھے۔

دمِ آخر سرِ بالیں وہ شرمندہ سے بیٹھے ہیں
زبانِ حال سے کچھ کہہ رہی ہیں ہچکیاں میری

چنانچہ دھجیاں۔ مایوسیاں۔ محرومیاں۔ بیڑیاں، قفس کی تیلیاں، فنا سامانیاں۔ عام قافیے تھے۔ جن سے آپ اندازہ فرما سکتے ہیں کہ کس فلسفہ کے شعر پیش کیے ہوں گے، ریڈیو پر یوں معلوم ہو رہا

تھا جیسے اسٹیشن والوں نے مائیکروفون (وہ آلہ جس کے ذریعہ پروگرام براڈکاسٹ کیا جاتا ہے) کسی قبرستان میں جاکر رکھ دیا ہو چیخ و پکار، آہ و نالہ، فریاد و شیون گریہ و بکا۔ کے مضامین سے مجلس مشاعرہ بزم ماتم بن رہی تھی۔ اتنے میں ایک بہت بڑے شاعر تشریف لائے، جنہوں نے یہ شکایت کی کہ مجھ پر وہ لوگ تنقید کرنے کو اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جنہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ میری نظریں کہاں ہیں۔ ہمارے کچھ ڈھارس بندھی کہ الحمد اللہ کوئی تو بلغ نظر۔ صاحب بصیرت بزم اقبال میں آیا لیکن ان کا "حسن مطلع" ملاحظہ فرمایئے۔ ارشاد ہے +

جہاں میں قابلِ تقلید تھی طرزِ فغاں میری — پپیہے نے بالآخر یاد کرلی پی کہاں میری

یہ ہے نمونہ اس قوم کے مشاعروں کا جس کی شاعری کے متعلق حضرت علامہ نے فرمایا ہے کہ :۔

تو ہے میت۔ یہ ہنر تیرے جنازے کا امام — نظر آئی جسے مرقد میں شبستانِ حیات

ہم قوم کے نوجوان شاعروں سے صرف اتنا عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اس سے پیشتر تو خیر ان کے پاس پھر بھی یہ عذر تھا کہ جس پرانی شاعری کا نمونہ ان کے سامنے ہے وہ ہے ہی اسی گور و کفن کے انداز کی لیکن حضرت علامہ کے کلام کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد تو ان کے پاس کوئی عذر نہیں رہ سکتا کہ وہ کس نمونہ کی تقلید کریں۔ دیکھیے کہ جن کی یادگار منانے کے لیے وہ اس اہتمام سے جمع ہوئے تھے وہ شعر اور دیگر فنونِ لطیفہ کے متعلق کیا ارشاد فرماتے ہیں۔

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن، — جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا!
مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے، — یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا!
جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا، — اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا!
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو، — جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا!
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں — جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا!

ہماری شاعری میں "افسردگیِ چمن" کے لیے کافی سامان فراہم ہو چکا ہے اب اس ماتم کو

چھوڑیے۔ اور کوئی کام کی بات بھی کیجیے۔ اور اگر آپ کسی وجہ سے اپنی شاعری کے اسی قسم کے نمونے پیش کرنے پر مجبور ہیں تو کم از کم اتنا تو کیجیے۔ کہ ایسی محفلیں کسی بند کمرے میں منعقد کر لیا کریں۔ محطۂ نشر الصوت کے ذریعے ساری دُنیا میں ان چیزوں کو نشر کرنا کون سی مصلحت ہے' دنیا آپکے ان احساسات سے جتنی کم واقف ہو اتنا ہی آپ کے لیے اچھا ہے کہ:-

تا مرد سخن نگفتہ باشد عیب و ہنرش نہفتہ باشد

گفتگوئے مصالحت

اور "شاہراہِ مقصود" جو جولائی کے پرچہ میں شائع ہو چکے ہیں۔ انہیں جناب شیخ فیض محمد صاحب ایم ایل اے۔ ڈیرہ غازیخان نے اپنے صرف پر پمفلٹ کی شکل میں عام اشاعت کی خاطر چھپوایا ہے۔ ر کا ٹکٹ برائے محصول ڈاک ارسال فرما کر مفت طلب فرمائیں۔

دفتر طلوع اسلام بلیماران دہلی

طلوع اسلام

صحیح اسلامی جماعت کے تخیل کے ماتحت شائع کیا گیا ہے' یہ کسی شخص کی ذاتی ملکیت نہیں۔ اور جس جماعت کے ہاتھ میں اس کا نظم و نسق ہے وہ اسکے خسارے کی تو ذمہ دار ہے لیکن اس کا منافع جب کبھی بعونہ تعالےٰ ہوا' اسی رسالہ پر صرف کیا جائیگا۔

دائرہ طلوع اسلام بلیماران دہلی

فرنگی تمدن

(از علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ)

یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے — حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
یہ علم یہ حکمت یہ تدبر یہ حکومت — پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات
بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس — کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات
وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم — حد اسکے کمالات کی ہے برق و بخارات

ہے دل کیلئے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

تکلف برطرف

"رازی"

آزادی کا مفہوم

قوم پرست مسلمانوں میں سے بعض حضرات بڑے جوشیلے واقعہ ہوئے ہیں ان میں سے ایک صاحب کا عزیز ترین مشغلہ یہ ہے کہ جا و بیجا اسلام اور مسلمانوں کی تحقیر و تذلیل اور کانگریس اور ارباب کانگریس کی تعریف و توصیف میں خامہ فرسائی کی جائے انہوں نے اسلام سے بیزار ہوکر اور کانگریس کی آغوش میں پناہ لیکر اطمینان کا سانس لیا ہوگا کہ وہ قیود اور پابندیاں جو مذہب کی دقیانوسیت ، کا تقاضا ہیں ان سے توجان چھوٹی ۔ لیکن گذشتہ سال میں جس وقت کانگریس کے بعض صوبوں میں انسداد مے نوشی کی عملی تجاویز منظور ہوئیں ۔ تو یہ جس انداز سے جھلائے اور جھنجلائے ہیں وہ تماشا دید کے قابل تھا ۔ کچھ وقت تک تو انہوں نے بیتابی کی کروٹیں بدلیں ۔ دل پر جبر کیا ۔ کچھ حوصلے سے کام لیا ۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ احکام کانگریس کی خلاف ورزی ۔ مذہب کی خلاف ورزی نہ ہوگی ۔ کہ عمر بھر گالیاں دیتے رہو ۔ اور کوئی پوچھنے والا ہی نہ ہو ۔ یہاں تو خلاف ورزی کر جیل خانے کی ہوا کھانی پڑے گی ۔ تو پھر ان سے ضبط نہ ہوسکا ۔ کانگریس کو گالیاں تو دے نہیں سکتے تھے اس لئے نہایت واعظانہ انداز میں پند و نصیحت کا شیوہ اختیار کیا ۔ فرماتے ہیں ۔

> میں کانگریس کے متعلق اس سے زیادہ کیا لکھ سکتا ہوں کہ میں اس کے پرستاروں میں سے ہوں اور میرا عقیدہ ہے کہ کانگریس اور صرف کانگریس ہی ہمارے مظلوم برِاعظم کی نجات کا ذریعہ بن سکتی ہے ۔ مگر کانگریس کو اپنے سیاسی حدود سے تجاوز کرکے نوعِ انسانی کے ازلی رجحانات میں دخل دینے کا ارتکاب ہرگز نہ کرنا چاہیئے ورنہ اس کی ہردلعزیزی میں سخت فرق آنے کا اندیشہ ہے

کانگریس کو شاید علم نہیں کہ نوع انسانی کے واسطے کوئی ضابطۂ اخلاق یا نظام روحانی مرتب کرنا بچوں کا کھیل نہیں۔ عظیم الشان پیمبروں کی حسرتناک تاریخیں اور ان کی پاک زندگی کے حوصلہ شکن حالات ہمارے سامنے ہیں اور ہم سے صاف الفاظ میں کہہ رہے ہیں کہ انسان کی دکھتی ہوئی رگ کا چھیڑنا کس قدر بے نتیجہ اور خطرناک ہوا کرتا ہے۔...... مذہب کا بیان یہ ہے کہ "خدا" نے انبیاء کے ذریعہ سے نوع انسانی کی اصلاح کرنا چاہی تھی اور اس سلسلہ میں ہزاروں نہیں لاکھوں انبیاء مبعوث فرمائے گئے تھے۔ مگر نتیجہ کیا ہوا؟ مجھ سے جواب طلب نہ فرمائیے۔ عام انسانی حالات و میلانات کو دیکھکر خود اندازہ کر لیجئے کہ انسانیت کا سواد اعظم اسوقت کس راستے پر گامزن ہے۔ جب ان امور میں حالات کی رفتار اس شدت کیساتھ حوصلہ شکن اور یاس انگیز رہی ہے۔ تو کانگریس کو خود غور کرنا چاہیئے کہ اس شعبے میں اس کے مساعی کہاں تک مشکور ہو سکتے ہیں...... ان امور پر نظر رکھتے ہوئے میں کانگریس کی خدمت میں پھر عرض کرونگا کہ وہ اپنے دائرۂ عمل کو محض سیاسیات تک محدود رکھے اور رشد و ہدایات کے دائرے میں داخل ہونے کی کوشش سے ہاتھ اٹھالے۔ (کلیم بابت نومبر ۱۹۳۶ء۔ اشارات)

خسر الدنیا والاخرۃ (دنیا اور آخرت دونوں میں ذلت) اس کو کہتے ہیں۔ خدا کو چھوڑا کہ وہ پابندیاں عائد کرتا ہے۔ اور کانگریس میں پہنچے کہ وہاں تو خوب آزادی ہے۔ لیکن کانگریس نے بھی جب "نوع انسانی کے ازلی رجحانات کے دخل دینے کا ارتکاب" شروع کر دیا تو حیران ہیں کہ اب کیا کریں۔

مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

یہ ہیں وہ "مسلم نیشنلسٹ" حضرات جن کی شمولیت سے کانگریس اس بات پر فخر کر رہی ہے کہ "آزادی پسند" مسلمانوں کا طبقہ تو اس کے ساتھ ہے۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ "آزادی"

لہ نعوذ باللہ من ذالک طلوع اسلام

سے جوان قومیت پرست حضرات کا کیا مفہوم ہے۔ اور یہ کیوں اسلام سے متنفر ہو رہے ہیں

لیکن افسوس تو ان علماء حضرات پر ہے کہ وہ خدا اور مذہب کے خلاف یہ سب کچھ سنتے ہیں لیکن ایک حرف بھی اس کے خلاف نہیں کہتے۔

برائے بیت گفتن

شراب کے متعلق یہی صاحب دوسری جگہ۔ نہیں بلکہ نہایت متانت و سنجیدگی سے کلیم بابت اپریل ۱۹۳۸ء کے اشارات میں فرماتے ہیں۔

کس قوم کے طبائع زندہ دل اور رنگین مزاج افراد شاہد و شراب کو پسند نہیں کرتے؟ مگر فرق صرف اس قدر ہے کہ زندہ قوموں کے افراد ان متذکرہ بالا فرائض بشری کو اس خوبی کے ساتھ ادا کرتے ہیں کہ اس سے ان کی عقلیں روشن۔ دل قوی اور تندرستیاں قابل رشک بن جاتی ہیں اور یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اس (یعنی شراب) میں قدرت نے نوع انسانی کے واسطے کیا منفعتیں پوشیدہ رکھی ہیں۔ لیکن اس کے برخلاف مردہ قوموں کے افراد جب اس کی جانب خیر سے متوجہ ہوتے ہیں تو اس قدر بے اعتدالی برتتے ہیں کہ ان کی عقلیں تاریک، دل کمزور اور تندرستیاں قابل ماتم ہو جاتی ہیں اور وہ چیز جو بحکم آلام حیات قطعی طیب و حلال ہے۔ ان کی بے اعتدالیوں کے ہاتھوں ناپاک۔ حرام اور عمل شیطانی ہو کر رہ جاتی ہے"

شراب کے متعلق "اعتدال" برتنے سے عقل کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ اس کی شہادت تو کسی "زندہ قوم" کے افراد کے اعمال حیات سے مل سکے گی۔ لیکن اس کی بے اعتدالی کا جو نتیجہ ان صاحب نے نکالا ہے۔ اس کا ثبوت تو ہر مہینے "کلیم" کے اشارات سے مل جاتا ہے۔

لیکن دو قدم اور بھی آگے چلئے اور دیکھئے کہ یہ صاحب کس قدر دلچسپ واقع ہوئے ہیں۔

کسی صاحب نے۔ جنہیں یہ صاحب "علامہ" لکھتے ہیں۔ لکھدیا کہ

"امریکہ میں شراب معاون صحت ہوسکتی ہے۔"

اس پر یہ صاحب تبصرہ فرماتے ہیں۔

"ایک مسلمان شراب کے متعلق یہ رائے رکھے کہ وہ بعض خاص حالات اور بعض خاص ممالک میں مفید صحت بھی ہوسکتی ہے۔ کیا یہ کھلا ہوا قرآن کا انکار نہیں ہے! وہ شراب جس کے متعلق قرآن یہ کہتا ہے کہ اس کی مضرتیں بہت بڑھی ہوئی ہیں۔ وہی شراب حضرت "علامہ" کے نزدیک امریکہ میں معاون صحت ہوسکتی ہے۔ "علامہ" سے دریافت کیا جائے کہ قرآن تو ہر قوم۔ ہر ملک اور ہر زمانہ کیواسطے نازل ہوا ہے اور اگر مسلمان کا یہ دعوی صحیح ہے تو شراب کے باب میں دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں۔ یا تو شراب ہر قوم، ہر ملک، ہر آب ہوا اور ہر زمانہ کیواسطے مضر ہے۔ یا نعوذ باللہ خدا سے یہ چوک ہوئی ہے کہ وہ امریکہ اور امریکہ کیطرح کے دیگر سرد ممالک کو مستثنیٰ کرنا بھول گیا لیکن حضرت "علامہ" کو ان موشگافیوں سے کیا سروکار۔ ضرب خواہ بندے پر پڑے خواہ خدا پر انہیں تو اپنی علامیت کا سکہ بٹھانا مقصود ہے۔" (کلیم۔ اشارات بابت جولائی ۱۹۳۸ء)

ہمیں یہ تو معلوم نہیں کہ یہ حضرت "علامہ" کون بزرگ ہیں اور ان کے مذکورہ صدر فتوے کا محرک کونسا جذبہ ہے۔ لیکن ہم کلیم کے "علامہ" سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ وہ قرآن جو ہر قوم ہر ملک اور ہر زمانہ کیواسطے نازل ہوا ہے۔ کیا ان کے اپنے لئے بھی نازل ہوا ہے یا اپنے لئے وہ کسی اور "قرآن" سے فتوی حاصل کرتے ہیں!! یہ ہیں ہمارے "آزادی کے علمبردار لیڈر"!!!

اسلامی زندگی کیا ہے؟

اور غیر اسلامی زندگی کیا ہے! قرآن کریم نے حیات انسانی پر کیا اثر ڈالا نوع بشری کے ضمیر کی تشکیل کس طرح فرمائی، وہ حدود کیا ہیں جن پر قائم رہ کر انسان عروۃ الوثقی پر پہنچ جاتا ہے اور ان کو نظر انداز کر کے اسفل السافلین میں گر جاتا ہے؟ اگر آپ

ان سوالات کا جواب

حاصل کرنا چاہیں تو کتاب "اسلامی معاشرت" کا مطالعہ کیجئے اپنی عورتوں اور بچوں کو پڑھائیے۔ اور دیکھئے کہ قرآن کریم آپ کی زندگی کے قدم قدم کیلئے کسطرح شمع ہدایت بنتا ہے اسلامی معاشرت۔ کتاب الٰہی کا عطر خلاصہ، نچوڑ، اور زندگی کا بہترین دستور العمل ہے ایک کاپی ۴ر کے ٹکٹ ارسال فرما کر طلب کیجئے۔ (دفتر طلوع اسلام بلی ماران دہلی)

محبت و سلامتی کا پیغام

آج دنیا جس امن و سلامتی اور محبت کی طلبگار ہے وہ سوائے قرآن کریم کے دنیا کے کسی گوشہ میں نہیں مل سکتی۔ دنیا جنگ و جدال اور نوع بشری کی تقسیم در تقسیم سے گھائل ہو چکی ہے اس کو ایسے مرہم کی تلاش ہے جو زخموں کو مندمل کر کے زمین کو انسان کے لئے بہشت زار بنا دے۔

"رسالہ پریم اور شانتی کا مذہب"

آپ کو بتائے گا کہ یہ دولت صرف اسلام کے آستانہ پر ملتی ہے آپ بھی اس کا مطالعہ فرمائیے اور کثرت سے غیر مسلموں میں تقسیم کر کے بتائیے کہ اسلام سراپا محبت و سلامتی ہے تین پیسے کے ٹکٹ ارسال کرنے پر یہ رسالہ مفت ارسال کیا جائے گا۔

دفتر طلوع اسلام بلی ماران دہلی

واردھا کی تعلیمی سکیم اور مسلمان

(ایک عظیم الشان خطرے سے آگاہی)

(رازی)

تمہید

تاریخ عالم کے زمانۂ قدیم پر نگہ ڈالیے تو آپ کو نظر آئے گا کہ قوت و سطوت کی مالک قومیں دوسری قوموں کو تباہ و برباد کرنے کے لیے قتل و غارتگری اور کشت و خون کے کیا کیا طریقے اختیار کرتی ہیں چنگیز خان و ہلاکو کی خونچکاں داستانیں صفحاتِ تاریخ پر خون کے حروف میں لکھی ملتی ہیں، فرعون و نمرود، شداد و ہامان کے جور و استبداد کے واقعات پڑھنے والے کی روح میں کپکپی پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ دورِ جہالت تھا، علانیہ سبعیت و بربریت کا زمانہ تھا، عصرِ حاضر کا مہذب انسان اس دورِ وحشت کو سخت نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اپنے زمانہ کو خدا کی برکتوں اور رحمتوں کا زمانہ سمجھتا ہے کہ جس میں قتل و خونریزی کی وہ داستانیں نہیں دہرائی جاتیں جن میں انسانیت تڑپتی، بلکتی، پھڑکتی نظر آئے، لیکن جو لوگ حقائقِ اشیاء کو گہری نظر سے دیکھتے ہیں ان پر حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ عصرِ حاضر کا مہذب انسان بھی دوسروں کی ہلاکت اور بربادی میں عہد جہالت کے وحشی انسان سے کسی حالت میں کم نہیں ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ وہ عہدِ جہالت تھا جب میں انسان نے ابھی یہ نہ سیکھا تھا کہ اپنی ستم کوشیوں اور ظلم رانیوں کو کس طرح اصلاح و بہبود کے خوش آئند نقاب اڑھائے وہ جو کچھ کرتا تھا کھلم کھلا کرتا تھا، بتاکر، جتاکر، دکھاکر کرتا تھا لیکن آج انسان عقل و حکمت میں بہت ترقی کر چکا ہے۔ آج اسی طرح کھلم کھلا اپنی ہوسِ خون آشامی کو پورا کرنا حماقت سمجھا جاتا ہے آج سب سے زیادہ مدبر، سب سے زیادہ ہوشیار وہ ہے جو

دوسروں کا خون اس انداز سے پی جائے کہ اس کا دھبہ تک کہیں نظر نہ پڑے، وہ دوسروں کی متاعِ حیات کو اس مشفقانہ انداز سے لوٹ لے کہ اسپر رہزن و قزاق ہونے کا شبہ تک نہ ہو، وہ ناصح و مصلح کے معصوم لباس میں قوم کی قوم کو تباہ کر جائے دریں حالت کہ لٹنے والوں کو پتہ ہی نہ چلے کہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے، دَورِ جہالت کا وحشی اور ظالم انسان آج تک بدنام چلا آتا ہے کہ اس کے جور و ستم کی ہلاکت آفرینیاں گویا ایک طوفان بلاخیز ہیں جو کف بر دہاں بڑھتا، اُمنڈتا بپھرتا چلا آتا ہے کہ جس کی طغیانیوں کو اندھے بھی دیکھتے ہیں اور جس کی شور انگیزیوں کو بہرے بھی سنتے ہیں لیکن دورِ حاضر کے مہذب انسان کی استہلاک و تخریب کی چالیں ایک پرسکوت دریا کی مانند ہیں کہ جس کی روانیوں میں نہ شور ہے نہ تموج۔ لیکن سطح آب کے نیچے ایسے ایسے خوفناک گرمچھ . . . . چھپے چلے آتے ہیں کہ قوم کی قوم کو تباہ کر دیں لیکن نہ دیکھنے والی آنکھیں دیکھ سکیں اور نہ سننے والے کان سن سکیں، اس پرسکوت طریق تخریب اور اس آتش خاموش میں سب سے بڑا حصہ تعلیم کو حاصل ہے آپ جس قوم کو تباہ و برباد کرنا چاہیں، نہایت خاموشی سے اُس کے طریقِ تعلیم کو بدل دیجیے، وہ رفتہ رفتہ غیر محسوس طور پر ہلاکت و بربادی کے عمیق و مہیب غاروں میں کھنچی چلی جائے گی اور اُسے پتہ اُسوقت چلے گا جب وہ سکرات موت کی ہچکیاں لے رہی ہو گی جنت اکبر مرحوم نے اس جانکاہ حقیقت کو کس قدر بلیغ اور اپنے مخصوص انداز میں بیان فرمایا ہے کہ ؎

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی!

انگریزوں کا طرزِ عمل

جب ہندوستان میں انگریزوں کے پاؤں جمنے شروع ہوئے، تو انھوں نے سب سے پہلے مسئلہ تعلیم ہی کو لیا لارڈ میکالے کی مشہور و معروف کمیٹی کی روئداد کسکی نگاہ سے پوشیدہ ہے۔ سوال یہ تھا کہ ہندوستانیوں کو انگریزی تعلیم دی جائے یا نہیں خود انگلستان میں اس مسئلہ کے موافق و مخالف

دو پارٹیاں بن گئی تھیں، سوال اتنی اہمیت اختیار کر گیا تھا کہ جب تک حل نہ ہوا کسی کو چین نہ پڑا ہندوستانی دل میں سمجھتے ہونگے کہ اللہ میاں نے کیسے فرشتوں کو ہم پر حکومت کرنے کے لیے بھیجا ہے جو ہماری تعلیم کے لیے یوں گھلے جا رہے ہیں، وہ جماعت جو انگریزی تعلیم کے مخالف تھی اُنکے دلائل بڑے قوی تھے۔ لیکن لارڈ میکالے نے اُس کے خلاف ایک ایسی محکم دلیل پیش کی کہ جس کے سامنے فریق مخالف کے تمام دلائل دھرے کے دھرے رہ گئے، اُس نے کہا کہ انگریزی تعلیم دینے سے آہستہ آہستہ ہندوستانی ایک ایسی قوم میں تبدیل ہو جائیں گے جو رنگ اور نسل کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہوگی۔ لیکن خیالات رُجحانات، تہذیب، معاشرت کے لحاظ سے یکسر مغربی ہوگی اور یہ ظاہر ہے کہ جب کوئی قوم اپنی مخصوص تہذیب و تمدن کو کھو بیٹھے تو وہ ایک ایسا جسم بنکے رہ جاتی ہے۔ جس سے روح پرواز کر چکی ہو، چنانچہ اس دلیل کو بڑا وزندار سمجھا گیا اور ۱۸۳۵ء میں فیصلہ ہو گیا کہ ذریعہ تعلیم انگریزی ہونا چاہیے۔ یہ تو تھا بنیادی مسئلہ اب یہ معاملہ پیش ہوا کہ اس طریق تعلیم میں جاذبیت کیسے پیدا کی جائے۔ تو اس کے لیے ۱۸۴۴ء میں لارڈ ہارڈنگ نے اعلان کر دیا کہ ملازمت میں ترجیح اس کو دی جائے گی جو انگریزی جانتا ہو یعنی جس طرح کنین تلخ کرنے کے زہر کو حلوے میں لپیٹ کر دیا جاتا ہے اسی طرح اس تعلیم کو روٹی میں لپیٹ کر پیش کیا گیا، ہندوؤں پر تو اس طریق تعلیم کا کوئی مضر اثر نہیں ہو سکتا تھا کہ اُن کی کوئی مخصوص تہذیب نہیں، تمدن نہیں۔ مذہب نہیں اس لیے اُن سے چھین کیا سکتا تھا، اُن کو نقصان کچھ نہ ہوا اور روٹی ضرور مل گئی لیکن مسلمان پر اس کا کیا اثر ہوا۔ یہ ہم سے نہیں خود ایک فاضل انگریز سے سُنیئے کہ اس طرح بتدریج اسلامی ہندوستان دارالحرب بنا دیا گیا اور ایک عظیم الشان روایات کی حامل قوم دُنیا میں یوں بے وقعت کر کے رکھ دی گئی ۱؎"

ہندو ذہنیت

وہ دور اب ختم ہو رہا ہے۔ حکومت اور قوت رفتہ رفتہ انگریز کے ہاتھ سے چھین کر ہندو اکثریت

۱؎ (THE INDIAN MUSLIMS. BY DR. HUNTER)

کے ہاتھ میں منتقل ہو رہی ہے ۔ مسلمان کی تخریب اور بربادی میں جو کچھ انگریز نے کیا وہ سارا نقشہ ہندوؤں کے سامنے ہے اور چونکہ ہندو نے سیاست سیکھی ہی انگریز سے ہے اس لئے ۔ آنچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم ۔ جو کچھ اُن کے اُستادوں نے کیا وہی کچھ یہ کر رہے ہیں اور کرنا چاہتے ہیں ان میں ایک گروہ تو ڈاکٹر مونجوں اور بھائی پرمانندوں کا ہے جو علانیہ کہتے پھرتے ہیں کہ بھارت ماتا کی پوتر بھومی ان ملیکش مسلمانوں کے چرنوں سے اپوتر نہیں رکھی جاسکتی ۔ انہیں یا تو ہندو بن کر رہنا ہوگا یا عرب کیطرف چلے جانا پڑے گا لیکن یہ طریق کار اس دورِ جاہلیت سے ملتا جلتا ہے جس کا ذکر ہم شروع میں کر آئے ہیں ۔ اس لئے انہی میں کا دوسرا گروہ اِس طریق کار کو ترجیح دیتا ہے جو دورِ "تہذیب" کی ایجاد ہے ، اور جس پر انگریز عمل پیرا رہا ہے ، یعنی وہ ایک ناصحِ شفق بنتا ہے وہ ایک سادھو منش ، خدا رسیدہ ، مہاتما کا چولا پہنتا ہے اور ایسا ہم رنگ زمیں دام بچھاتا ہے کہ بھولے بھالے پرندے سمجھ بھی نہیں سکتے کہ یہاں کوئی پھانسنے کی ترکیب بھی کر رکھی ہے ۔ آپ کو معلوم ہے کہ مہاتما گاندھی ایک عرصہ سے اپنے آپ کو عملی سیاست سے الگ بتا رہے ہیں حتےٰ کہ جب کانگریس کے کسی طرزِ عمل کے متعلق ان سے شکایت کی جاتی ہے تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ بابا! میں تو "چار آنہ والا" ممبر بھی نہیں ہوں ۔ میں ایشور بھگتی میں لگا ہوا ہوں ، مجھے دُنیا داروں کے ان جھگڑوں سے کیا واسطہ ۔ جب انھوں نے عملی سیاست کو چھوڑا تو سب سے پہلے اچھوتوں کے ادھار (اصلاح) کی اسکیم کو ہاتھ میں لیا ، انھوں نے دیکھ لیا کہ آئندہ ہندوستان کا نظامِ حکومت جمہوری ہوگا جس میں تمام امور کا فیصلہ کثرتِ رائے ، یعنی آبادی کے شمار کے اعتبار سے ہوگا جو قوم تعداد میں زیادہ ہوگی وہی حکومت کرے گی ۔ اچھوتوں کے ساتھ جو سلوک ہندوؤں نے روا رکھا ہے وہ خود اچھوتوں کی حالت سے ظاہر ہے ، آج چونکہ عام بیداری کا زمانہ ہے اس لئے اچھوتوں نے بھی اپنی ذلت و خواری کا احساس کیا ۔ مہاتما جی کو فکر لاحق ہوگئی کہ اگر انھوں نے ان مظالم کے انتقام کے طور پر جو ہندوؤں نے صدیوں سے ان پر توڑ رکھے ہیں ، یہ فیصلہ کر لیا کہ یہ ہندوؤں سے الگ ہوتے ہیں تو سوراج کس کام کا ، فوراً نوعِ انسانی کی ہمدردی کی رگ اُن کے نحیف و لاغر جسم میں پھڑک اٹھی ،

پست وزبوں حال اچھوت کی دکھ بھری داستان نے ان کا جگر خون کر دیا۔ اُن پر راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام ہوگیا۔ پونہ میں پران تیاگ برت رکھا گیا اور جب تک یقین نہیں ہوگیا کہ اچھوت مردم شماری کے رجسٹر میں اپنے آپ کو ہندو ہی لکھوائیں گے کسی اور طرف توجہ ہی نہیں کی، یہ مہاتما جی کی زندگی کا پہلا نصب العین ہے۔ اس کے بعد ایک اور اہم مسئلہ ان کے سامنے آیا۔ وہ بساطِ سیاست کو بڑی گہری نظروں سے دیکھتے ہیں۔ انھوں نے محسوس کیا کہ جب تک ملک کی زبان ہندی نہیں ہو جاتی اقلیتیں اکثریت کے اندر جذب نہیں ہوسکتیں، زبان کا مسئلہ کس قدر اہم ہے اس کا ذکر ہم آگے چلکر کریں گے۔ اس مسئلہ میں جب انہیں اطمینان ہوگیا کہ ہوگا وہی جو وہ چاہتے ہیں تو اب ایک قدم اور آگے بڑھے، وہی چیز جو میکالے کے وقت میں انگریز کے پیش نظر تھی۔ وُہی اِن کے سامنے آئی۔ انگریز کی سیاست نے انہیں خوب بتا رکھا تھا کہ یاد رکھو جو قوم اپنی تہذیب۔ کلچر، مذہب کو الگ رکھنے کی متمنی ہو اُسے علانیہ شدھ کرنے کو نہ اٹھو بلکہ طریقِ تعلیم بدل دو۔ تھوڑے عرصے کے بعد وہ خود بخود شدھ ہو جائے گی۔ چنانچہ اس چیز کے پیش نظر مہاتما جی نے آزاد ہندوستان کے لیۓ ایک تعلیمی اسکیم کے اُصول وضع کیۓ جسے واردھا اسکیم کہتے ہیں۔ اور ان اصولوں کی فروعات وجزئیات مرتب کرنے کے لیۓ ایک کمیٹی بنا دی، چونکہ خطرہ تھا کہ مسلمان اعتراض کریں گے کہ ہندوؤں کی وضع کردہ اسکیم اُن پر کیوں نافذ کی جارہی ہے۔ اس لیۓ اس کمیٹی کے صدر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پرنسپل جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب متعین کردیے گۓ، اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ مرتب کی جو رسالہ جامعہ بابت ماہ جنوری سنہ ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی ہے، یہی وہ رپورٹ ہے جس کے متعلق ہم نے دیکھنا ہے کہ اس طریق تعلیم کا مسلمانوں پر کیا اثر پڑے گا۔ اور مسلمان مذہبی نقطۂ نظر سے اُسے کس حد تک تسلیم کرسکتے ہیں۔ اس لیۓ کہ دنیا کا کوئی معاملہ ہو ایک مسلمان کے لیۓ لازمی ہے کہ اسے قرآن کریم کی میزان سے تولے اور جو فیصلہ اس بارگاہ سے ملے۔ اُسے اپنے لیۓ قولِ فیصل سمجھے کہ:۔

مَنْ لَمْ یَحْکُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰئِکَ هُمُ الْکَافِرُوْن ۝

جو شخص معاملات کا فیصلہ قرآن کریم کی رُو سے نہیں کرتا اُسے اسلام سے کوئی واسطہ

ہیں، وہ کفار کے زمرے میں شامل ہے +

ہمیں اس سے نہ مہاتما گاندھی کی ذاتی مخالفت مقصود ہے نہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کی، ہم تو یہ جانتے ہیں کہ موجودہ وقت سیاست ہند میں ایک بڑا نازک وقت ہے، سابقہ حکومت کا طلسم ٹوٹ رہا ہے۔ اور اس کی جگہ مقدرات کے نئے نئے ستارے منصۂ شہود پر آرہے ہیں مسلمان سابقہ دورِ حکومت میں جس قدر نقصان اٹھا چکا ہے اس کا تقاضا ہے کہ ایسے وقت میں جب کہ مستقبل کے لیے اُس کی قسمتوں کے فیصلے ہو رہے ہیں۔ یہ سوچے، غور کرے کہ میرے ساتھ اب کیا ہونے والا ہے، یہی وہ جذبہ ہے جسنے ہمیں مجبور کیا ہے کہ ہم اس تعلیمی اسکیم کو خالص قرآنی نقطۂ نگاہ سے دیکھیں، اور ہمیں جہاں جہاں خطرات پوشیدہ ملیں، انہیں بے نقاب کر کے مسلمان کے سامنے رکھ دیں تاکہ اُسے معلوم ہو جائے، کہ اب کس طرح

میری بربادیوں کے تذکرے ہیں آسمانوں میں

متحدہ قومیت کی تشکیل

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ مستقبل کے ہندوستان میں ہندوؤں کے ارادے کیا ہیں۔ تحریک آزادی کا مطمحِ نگاہ کیا ہے تفصیل تو اس کی طول طویل ہے لیکن دو لفظوں میں ہندوؤں کا اس سے مقصود یہ ہے، کہ "ہندوستان میں ہماری کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ ایک متحدہ قوم پیدا ہو" پنڈت جواہر لال نہرو۔ مضمون مطبوعہ رسالہ جامعہ بابت اکتوبر ۱۹۳۶ء "یہ متحدہ قوم پیدا کیسے ہوگی۔ اس کے لئے یو۔پی کے وزیر تعلیم سوامی سمپورا نند کی وہ تقریر ملاحظہ فرمایئے جو گزشتہ اپریل انھوں نے تعلیم کے موضوع پر فرمائی تھی جس کے دوران میں وہ کہتے ہیں۔

> "ہر وہ شخص جو ہندو یا مسلم تہذیب کے قایم رکھنے اور اس کو مدارس میں جاری کرنے پر زور دیتا ہے، وہ یقینی طور پر ملک کو نقصان پہونچاتا ہے۔ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ چیز ہندوستان میں مفقود ہونی چاہیئے .... جب ہندو مسلم تہذیبیں مٹ

جائیں گی تب ہی ہندوستانی تہذیب زندہ رہ سکے گی۔" (بحوالہ ٹریبون و مدینہ)
ایک دفعہ پھر سُن لیجیے کہ ہندوؤں کی کوئی مخصوص تہذیب نہیں۔ کوئی مذہب نہیں۔ اس لیے آپ جب کبھی یہ سُنیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی مخصوص تہذیب کو مٹا دیا جائے تو بلا تامل سمجھ لیجیے کہ اس سے مقصود مسلمانوں کی تہذیب و مذہب کو مٹانا مقصود ہے، ہندو کا لفظ ساتھ اس لیے چپاں کر دیا جاتا ہے کہ مسلمان بدک نہ جائیں۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ جب ہندوؤں کی کوئی تہذیب نہیں، کوئی مذہب نہیں تو ان کا مٹے گا کیا۔ یہ ہم نہیں کہتے کہ ہندوؤں کا کوئی مذہب نہیں کوئی تہذیب نہیں، خود ہندوؤں سے سنیے:۔

"ہندو مت کے دائرے میں بے حد مختلف اور متضاد خیالات اور رسوم داخل ہیں اکثر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہندو مت پر صحیح معنی میں لفظ مذہب کا اطلاق ہی نہیں ہوتا۔۔۔ ممکن ہے کہ ایک شخص کھلم کھلا خدا کا منکر ہو جیسے قدیم فلسفی چارودک، لیکن کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ شخص ہندو نہیں رہا۔ جو لوگ ہندو گھرانوں میں پیدا ہوئے ہیں وہ چاہے کتنی ہی کوشش کریں ہندو مت ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا میں برہمن پیدا ہوا تھا۔ اور برہمن ہی سمجھا جاتا ہوں چاہے مذہبی اور سماجی رسموں کے متعلق میرے خیالات اور اعمال کچھ ہی ہوں" (پنڈت، جواہرلال نہرو کی خود نوشت سوانح عمری ترجمہ اُردو جلد اول صفحہ ۲۰۲-۲۰۳)

تو آپ سمجھ گئے کہ ہندوؤں کے پیشِ نظر سب سے مقدم یہ مسئلہ ہے کہ مسلمان کی الگ مخصوص تہذیب کو مٹا دیا جائے، تاکہ یہ متحدہ قومیت میں جذب ہو جائے اور اس طرح ایک ایسی قوم کا وجود عمل میں آ جائے جو نام کے اعتبار سے تو مسلمان رہے، لیکن تہذیب و تمدّن۔ خیالات، رجحانات، معاشرت کے لحاظ سے خالص ہندی ہو، وہی نظریہ جو میکالے کے سامنے تھا اور جس کے حصول کے لیے انگریزی طریق تعلیم کو اختیار کیا گیا تھا۔ اب اُسی مقصد کے حصول کے لیے ایک نیا طریق تعلیم آسمانِ وارد ھا سے الہام کی شکل میں نازل ہوا ہے جس کی تشریح شیخ الجامعہ نے فرمائی ہے۔ یہ بھی آپ نے دیکھ لیا ہے کہ

میکالے اسکیم میں کشش پیدا کرنے کے لیے روٹی کی جاذبیت چپاں کی گئی تھی، واردھا اسکیم
کی بنیاد بھی روٹی پر رکھی گئی ہے شروع سے اخیر تک اس اسکیم میں روٹی اور روٹی ہی کا شور ہے۔
یعنی مقصدِ اولیں تو یہ ہے کہ اس طریقِ تعلیم سے مسلمانوں کو ان کے مذہب اور اسلامی فلسفۂ
زندگی سے بیگانہ بنا دیا جائے اور اس طرح ہندوستان میں ایک متحدہ قومیت کا وجود عمل میں آجائے
لیکن جو نصاب تجویز ہوا ہے اس میں بظاہر بنیادی چیز صنعت و حرفت کی تعلیم رکھی گئی ہے،
تاکہ نگاہیں اس حصہ کے فوائد میں اُلجھ کر رہ جائیں اور دوسرے حصہ کے نقصانات کیطرف توجہ
نہ ہونے پائے، چنانچہ نصابِ تعلیم میں ساڑھے پانچ گھنٹے میں سے ساڑھے تین گھنٹے کے قریب
دستکاری کی تعلیم کے لیے رکھے گئے ہیں۔ اس سے آپنے اندازہ فرما لیا ہوگا کہ جہاں تک مسلمانوں
کی ملی خصوصیات مٹانے کا تعلق ہے ہندو کس طرح انگریز کے قدم بقدم جا رہا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ
انگریز نے جو کچھ کیا اُسکے نتائج کا نام غلامی تھا اور ہندو جو کچھ کر رہا ہے اس کا نام حصولِ آزادی
رکھا گیا ہے۔ انگریز جنکے توسط سے یہ کچھ کراتا تھا انکا نام ٹوڈی تھا لیکن ہندو جنکے ہاتھوں سے
یہ کچھ کراتا ہے وہ "محبِ وطن" اور خادمِ ملت کہلاتے ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ:۔

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی، نہ حریفِ پنجہ فگن نئے وہی فطرتِ اسداللہی، وہی مرحبی وہی عنتری

غیر مسلم کی راہ نمائی

یہ طویل تمہید اس لیے ضروری تھی کہ جب تک کسی تحریک کا پس منظر (BACK GROUND)
آپکے سامنے نہ ہو، آپ پر اس کے صحیح اثرات و نتائج واضح نہیں ہو سکتے۔ اسکیم زیرِ نظر میں سب سے پہلے
یہ دیکھیے کہ وہ مسلمان جو دنیا کی امامت کے لیے پیدا کیا گیا تھا اس کی آج حالت یہ ہو چکی ہے کہ وہ
دنیا کی ہر شاہراہ پر غیر مسلموں کی راہ نمائی کا محتاج ہو چکا ہے، "غلام" مسلمان اپنی ہدایت و
راہ نمائی کے لیے سمائے شملہ و لندن کے "الہامات" کا منتظر رہتا تھا۔ اب "آزاد" مسلمان اپنی ہدایت
کے لیے واردھا اور آنند بھون کے دیوی دواروں کیطرف کان لگائے رہتا ہے انگریز سے اس

کے کسی فیصلے یا ہدایت کی دلیل مانگنا آئینِ وفا شعاری کے خلاف تھا کہ اس کے فیصلوں کی صحت کی دلیل اس کا "اقبالِ حکومت" تھا۔ گاندھی جی سے ان کے فیصلوں یا ہدایات کی دلیل مانگنا خلافِ رسمِ پرستاری ہے کہ اُنکے ہر فیصلے کی صحت کی دلیل وہ "اندرونی روشنی" ہے جس کی بنا پر انہیں معصوم عن الخطاء۔ مافوق البشر انسان یعنی اوتار سمجھا جاتا ہے۔ انگریز کی غلامی استبداد کی غلامی تھی۔ گاندھی جی کی غلامی عقیدت کی غلامی ہے مسلمان کے لیے نتیجہ دونوں کا وہی ذلّت و پستی ہے جسے جذبۂ مرعوبیت (INFERIORITY COMPLEX) کہتے ہیں چنانچہ جناب ڈاکٹر صاحب ممدوح اپنی رپورٹ کو مہاتما جی کے رو برو ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

> "ہم یہ رپورٹ آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے سچے دل سے اُمید کرتے ہیں کہ آپ کی رہنمائی میں یہ اسکیم ہمارے ملک میں تعلیم کے ایک اچھے نظام کی بنیاد ثابت ہوگی" (صفحہ ۱۰۸)

تعلیم کے بنیادی اصولوں کی تمہید میں رقمطراز ہیں:-

> "اور میدانوں کی طرح اس میدان میں بھی مہاتما گاندھی کی سوجھ بوجھ اور رہنمائی آڑے وقت میں ہمارے کام آئی" (صفحہ ۱۱۱)

اللہ اکبر! وہ مسلمان جس کے متعلق ارشاد تھا کہ کنتم خیر اُمّت اخرجت للناس۔ تم نوع انسانی میں سے بہترین قوم ہو۔ جس کی شان یہ تھی کہ وکذالک جعلناکم اُمّۃ وسطاً لتکونوا شہداء علی الناس۔ اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک بہترین قوم بنا دیا تا کہ تمام نوعِ انسانی کے اعمال کے نگراں رہو۔ جس کا مرتبہ یہ تھا کہ انتم الاعلون۔ تم ہی دُنیا میں سب سے بلند و بالاتر ہو۔ جسکے مونسِ علیم اعلیٰ کے متعلق ارشاد تھا کہ انی جاعلک للناس اماماً۔ ہم نے تمہیں انسانوں کا امام، پیشرو، لیڈر بنایا ہے۔ جن کو حکم تھا کہ "دیکھنا غیر مسلموں کے خیالات کی اتباع نہ کرنا وہ تمہیں گمراہ کر دیں گے"! ان مسلمانوں کی آج حالت

یہ ہے کہ اپنے بچوں کی تعلیم کے مسئلہ کے حل کے لئے ایسے لوگوں کے دست نگر ہیں
جو روحِ اسلام سے یقیناً بیگانہ ہیں جس مومن کی یہ شان تھی کہ :-

مومنے بالائے ہر بالا ترے ❊ غیرتِ او بر نتابد ہمسرے

وہ مومن ایسے انسانوں سے ہدایت کا طالب ہے جن کی عقل آج تک انہیں اتنا بھی نہیں
بتا سکی کہ ایک مٹی کے بُت کے سامنے ماتھا ٹیکنا کوئی شرفِ انسانیت نہیں ہے، یہ پستیوں کی حد
نہیں تو اور کیا ہے ؟

اصل رپورٹ

رپورٹ زیرِ نظر کے مطابق یہ نیا طریقِ تعلیم سات برس سے چودہ برس کے لڑکے اور لڑکیوں
کے لئے لازمی ہوگا (صفحہ ۱۳۱) یعنی کسی شخص کو یہ اختیار حاصل نہ ہوگا کہ جب اس کی لڑکی یا لڑکا سات
برس کا ہو جائے تو اُسے اس اسکول میں نہ بھیجے جس میں یہ طریقِ تعلیم رائج ہو۔ یہ تعلیم جبری ہوگی۔
انگریز نے اپنے طریقِ تعلیم کو جبری نہیں بنایا تھا۔ یہ کمی اب سوراج کے زمانہ میں پوری ہوگی۔

اب سب سے پہلے اس نصاب کو دیکھ لیجئے جو اس اسکیم کی رُوح سے مرتب کیا گیا ہے۔

۱۔ بنیادی دستکاری .... ۳ گھنٹے ۔ ۲۰ منٹ

۲۔ گانا۔ ڈرائنگ اور حساب .... ۴۰ منٹ

۳۔ مادری زبان .... ۴۰ منٹ

۴۔ سماج کا علم اور عام سائنس .... ۳۰ منٹ

۵۔ کسرت .... ۱۰ منٹ

۶۔ بیچ کا خالی وقت .... ۱۰ منٹ

میزان ..... ۵ گھنٹے ۔ ۳۰ منٹ (صفحہ ۱۳۲-۱۳۱)

آپ کو یہ نصاب بڑا معصوم سا نظر آئے گا۔ اس میں بظاہر کوئی چیز ایسی نہیں جس سے مسلمانوں

کو خواہ مخواہ خطرات کا اندیشہ ہو لیکن یہ خطرات اس نصاب کی تفصیل کے اندر ہیں، آپنے یہ تو دیکھ ہی لیا ہوگا کہ اس نصاب میں مذہب کا کہیں نام نہیں. خود گاندھی جی اور اس اسکیم کے مرتب کرنے والے ہی اعلان کر رہے ہیں کہ ہمنے مذہب کو اس اسکیم سے بالکل الگ رکھا ہے لیکن جب ہم اس نصاب کی تفصیل کو دیکھتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ مذہب کا عنوان تو اس میں کہیں نہیں لیکن مسلمانوں کا مذہب اور ان کی تہذیب مٹانے کے لیے اس میں سب کچھ ہے لیکن وہ کچھ اس انداز سے رکھا گیا ہے کہ تاوقتیکہ گہری نظر سے نہ دیکھا جائے، اس کی اہمیت کا اندازہ ہی نہیں لگ سکتا + اس کا تجزیہ کرنے کے لیے اس اسکیم کو چار اہم عنوانات کے ماتحت مختلف ابواب میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(اول) مذہب کا مسئلہ جو بمنزلہ رُوح ہے۔

(دوم) فلسفۂ زندگی کا مسئلہ جو تہذیب اسلامی کی اصل ہے۔

(سوم) زبان کا مسئلہ جس پر کسی قوم کے کلچر (ثقافت) کا انحصار ہے۔

(چہارم) معاشرتی زندگی جو کسی قوم کے رجحانات قلبی و ذہنی کی آئینہ دار ہوتی ہے۔

ان مسائل پر مختلف ابواب میں آئندہ صفحات بحث کیگئی ہو مسئلہ اوّل و دوم چونکہ مقابلتہً زیادہ اہم اور پیچیدہ ہیں. اس لیے اُن پر نسبتاً شرح و بسط سے تبصرہ کیا جائے گا شق سوم ایک الگ مضمون کی محتاج ہے۔ اور شق چہارم میں زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہ ہوگی۔ وَمَا توفِيقِي اِلَّا بِاللهِ

بابِ اوّل

مذہب کا مسئلہ

نصاب میں جو عنوان "سماج کا علم" ہے اس کی تفصیل رپورٹ کے صفحات ۱۱۹-۱۱۸ پر دی ہوئی ہے، مذہب کے متعلق اس میں لکھا ہے۔

"دنیا کے مذہبوں کے اصول بتا کر یہ ثابت کیا جائے کہ خاص خاص باتوں میں سب مذہب ایک ہیں" (ص ۱۱۹)

اس اجمال کی تفصیل کے لیے وہ بیان مُلاحظہ فرمایئے جو مہاتما گاندھی نے اخبارات میں شائع کیا ہے، یہ بیان ایک وفد کے سوالات کے جواب میں شائع ہوا ہے جو یہ دریافت کرنے کے لیے مہاتما گاندھی کے پاس گیا تھا کہ واردھا اسکیم میں مذہب کی کیا پوزیشن ہوگی۔ آپنے فرمایا:-

"ہم نے واردھا اسکیم میں سے مذہبی تعلیم کو خارج کر دیا ہے کیونکہ ہمیں خطرہ ہے کہ جس طرح مذہب کی آجکل تعلیم دی جاتی ہے اور اُس پر عمل کیا جاتا ہے، وہ بجائے اتحاد کے اختلافات پیدا کرتے ہیں لیکن اس کے برعکس میرا یہ خیال ہے کہ سچائیاں جو ہر ایک مذہب میں مشترکہ طور پر پائی جاتی ہیں۔ بچوں کو پڑھائی جاسکتی ہیں اور ضرور پڑھائی چاہئیں۔ یہ سچائیاں الفاظ یا کتابوں کے ذریعے سے پڑھائی نہیں جاسکتیں۔ بچے اِن سچائیوں کو اپنے استاد کی روزانہ زندگی سے سیکھ سکتے ہیں، اگر وہ اُستاد خود مذہب کی سچائیوں کے مطابق زندگی بسر کر رہا ہو۔ صرف اسی صورت میں بچے یہ سیکھ سکتے ہیں کہ واقعی سچائیاں اور عدل و انصاف تمام مذاہب کے بُنیادی اصول ہیں"

جب یہ سوال کیا گیا کہ سات سے چودہ برس کی عمر کے بچے تمام مذاہب کی یکساں عزت کرنا سیکھ سکیں گے، تو مہاتما جی نے فرمایا:-

"ہاں۔ میرا خیال ہے کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ یہ حقیقت کہ تمام مذاہب اہم اصولی

باتوں میں بالکل ایک جیسے ہیں (بچوں کے دل میں یہ بات پیدا کردیں گے) کہ وہ دوسروں کے مذہب کی بھی ایسی ہی عزت کریں جیسی اپنے مذہب کی کرتے ہیں یہ بڑی سادہ سی سچائی ہے اور سات برس کے بچے اسے آسانی سے سیکھ سکتے ہیں اور اس پر عمل کرسکتے ہیں لیکن سب سے مقدم یہ ہے کہ استاد خود ایسا ہی عقیدہ رکھتا ہو" (نیشنل کال مورخہ ۸ جون ۱۹۳۸ء)

بظاہر یہ اصول آپ کو بڑی وسعتِ نظر کشادہ ظرفی پر مبنی نظر آئے گا، لیکن یہی وہ خطرناک گھاٹی ہے جہاں مسلمانوں کا مذہب تباہ کیا جائیگا، یاد رکھئے، مہاتما گاندھی اپنے الفاظ کے انتخاب میں بڑے ہوشیار واقع ہوئے ہیں، ان کی سطح ساکت وصامت دریا کی روانیوں کی طرح ہوتی ہے لیکن اُن کے نیچے بڑے بڑے خطرناک اژدہے چھپے ہوتے ہیں۔ سطح بیں نگاہیں اُن کی نظر فریب کشش سے دھوکا کھا جاتی ہیں جو سطح سے ذرا نیچے اُتر جائیں۔ اُنہیں وہ خطرات بے نقاب نظر آجاتے ہیں وہ عظیم الشان سازش، جو ان الفاظ کی معصومیت کے اندر نقاب پوش ہے۔ اُسے بے نقاب کرنے کے لئے ہمیں ذرا تفصیل سے کام لینا ہوگا۔

مذہب کی تشریح

مذہب میں ایک تو وہ مہمات اصول ہوتے ہیں جن پر اعتقاد کا دار و مدار ہوتا ہے۔ ان اصولوں کو ایمانیات کہا جاتا ہے۔ دوسری چیز ان اصولوں کی تفصیلات میں قوانین، عبادات، مناسک، شعائر یعنی ظواہر ہوتے ہیں جنہیں شریعت کہا جاتا ہے، ایمانیات یعنی اصولوں کا تعلق قلب و دماغ سے، سمجھنے سمجھانے سے ہوتا ہے اس لئے یہ غیر محسوس ہوتے ہیں لیکن مذہب کی بنیاد انہی پہ ہوتی ہے، ظواہر کا تعلق اعمالِ حیات سے ہوتا ہے۔ اس لئے وہ محسوس ہوتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ دو مختلف مذاہب، مثلاً اسلام اور ہندومت میں شرع و منہاج کا فرق تو محسوس فرق ہے، کون نہیں جانتا کہ مسلمانوں کے طریق نماز اور ہندوؤں کی پوجا پاٹ میں کس قدر اختلاف ہے،

ان محسوس و مشہود اختلافات کی موجودگی میں کسی کے سامنے یہ کہنا کہ اسلام اور ہندومت دونوں یکساں مذہب ہیں، اپنی ہنسی اُڑانا ہے، اِس لیے مہاتما گاندھی نے اس چیز کو تو چھوا نہیں البتہ اس کے متعلق یہ بات ذہن نشین کرادی کہ یہ محسوس اختلافات کوئی اہم باتیں نہیں ہیں۔ ثانوی (SECONDARY) چیزیں ہیں اصل مذہب تو وہ اصول ہیں جن کو وہ عالمگیر سچائی کہتے ہیں، یہ چونکہ غیر محسوس ہیں۔ ان کا اختلاف آنکھوں سے دیکھا نہیں جاسکتا۔ لہٰذا یہ اعلان کردیا کہ جہاں تک مذہب کے اُصولوں کا تعلق ہے اسلام اور ہندومت بالکل یکساں مذہب ہیں، دونوں میں اصولی سچائیاں ایک جیسی ہیں اسلام کو ہندومت پر کوئی برتری اور تفوق حاصل نہیں یہ دعوے بڑا آسان ہے اس لیے کہ ایمانیات کا فرق۔ اُصولی سچائیوں کا اختلاف محسوس شے نہیں مثلاً مسلمان بھی خدا پرست ہے اور ایک ہندو کو بھی دعوے ہے کہ وہ خدا کو مانتا ہے، اس لیے اس اصولی مسئلہ میں دونوں یکساں ہیں، سطح بین نگاہیں فوراً اِس دھوکے کا شکار ہو جاتی ہیں اِس چیز کو ثابت کرنے کے لیے کہ ہندو کی خدا پرستی اور مسلمان کی خدا پرستی میں کیا فرق ہے دونوں مذاہب کی مزعومہ یا حقیقی آسمانی کتابوں میں سے خدا کے تصور کو واضح طور پر سمجھانا پڑے گا یہ ذرا مشکل مرحلہ ہے اور ہر شخص کے ذہن میں یہ بُنیادی فرق راہ چلتے نہیں بٹھایا جاسکے گا، لہٰذا یہ وہ مقام ہے جہاں نہایت آسانی سے دھوکا دیا جاسکتا ہے، عیسائیت کو اسلام سے ہمیشہ یہی خطرہ رہا کہ مہاتِ اُصول میں جب دونوں کا باہمی موازنہ ہوگا تو عیسائیت ایک سکینڈ کے لیے بھی سامنے ٹھہر نہ سکے گی۔ اِس لیے انھوں نے ہمیشہ حقایق کو چھوڑ کر خالی جذبات کی راہ سے اسلام کا مقابلہ کرنا چاہا۔ ہندوں کو معلوم ہے کہ ایمانیات یعنی اُصولِ مذہب میں جب کبھی ہندومت اسلام کے سامنے آیا تو وہ مثلِ شیشہ کی طرح چورچور ہو جائے گا۔ اس لیے ہندوں نے اپنی اِس بُنیادی کمزوری کو چھپانے کے لیے مُدّت سے یہ روش اختیار کر رکھی ہے کہ یہ مشہور کیا جائے کہ بنیادی سچائیوں کے لحاظ سے تمام مذاہب ایک جیسے ہیں کسی میں کچھ فرق نہیں کسی کو دوسرے پر بڑائی حاصل نہیں، فرق صرف ظواہر (یعنی شریعت) میں ہے اور شریعت کچھ ایسی اہم شے نہیں، بلکہ مذہب کے جتنے

جھگڑے ہیں وہ شریعت کے اختلافات کی وجہ سے ہی ہیں یعنی محسوس اختلافات کو فتنہ و فساد کا موجب قرار دیا جائے اور غیر محسوس بنیادی اصولوں کو ہندو مت اور اسلام میں قدرِ مشترک (COMMON FACTOR) قرار دیا جائے یہ ایک بڑی گہری سازش ہے جو مدت سے اسلام کے خلاف آتش خاموش کی طرح پھیلائی جا رہی ہے اس کی ابتدا اکبر کے دین الٰہی سے ہوئی جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ مختلف مذاہب عالمگیر سچائیوں کے لحاظ سے سب ایک جیسے ہیں یہ وہ فتنہ عظیم تھا جس کو حضرت امام سرہندیؒ نے مسلسل جہاد سے کچلا۔ اور مختلف بزرگانِ دین نے بڑی بڑی قربانیوں سے اس سیلاب بلاانگیز کو آگے بڑھنے سے روکا، یہ وُہی دین الٰہی ہے جس کے متعلق بہار کے مسلمان کانگرسی وزیر ڈاکٹر سید محمود نے لکھا ہے کہ مستقبل کے آزاد ہندوستان میں ہندوستان کی متحدہ قومیت کا یہی مذہب ہونا چاہیئے (ملاحظہ ہو سوراجی اسلام مطبوعہ طلوع اسلام بابتہ ماہ جون)

جب دین الٰہی کی اس سازش نے وہاں شکست کھائی تو اس نے تصوف کے راستے سر نکالا اور یہ مشہور کیا کہ مسلمانوں کا تصوف اور ہندوؤں کی ویدانت ایک ہی ہے اور چونکہ مغز دین یہی حقیقت ہے اس لیے یہ دونوں مذہب ایک ہی ہیں۔ چنانچہ آپ نے اکثر سنا ہوگا کہ کئی ہندو مسلمان فقیروں کے معتقد بن بیٹھے ہیں، یہی وہ نظریہ ہے جس کے ماتحت مشاہیر اسلام میں سے حضراتِ علماء، صلحا، مجاہدینِ ملت کے مقابلہ میں صوفیائے کرام کو ترجیح دی جاتی ہے لیکن تصوف پھر بھی گوشوں اور زاویوں میں چھپنے کا مسلک تھا۔ اس لیے دنیائے معاشرت میں یہی نظریہ "برہمو سماج" کی شکل میں اُبھارا گیا۔ جو آج عملاً عام طور پر ہر قوم پرست مسلمان کا مذہب بن رہا ہے، جب زمین یوں ہموار ہوگئی تو گاندھی جی ایک قدم اور آگے بڑھے اور اپنی اسکیم میں مذہب کے متعلق یہی نظریہ تعلیم کا جزو لازم قرار دیا آپ سمجھے بھی کہ اس سے نتیجہ کیا نکلا! ہندومت جو اسلام کے سامنے ایک سیکنڈ کے لیے بھی ٹھہر نہ سکتا تھا، جسے مہذب محفلوں میں پیش کرتے ہوئے خود ہندو گھبراتے اور شرماتے تھے وہ ایک ہی جست میں ان پستیوں سے ابھر کر اسلام کے ہمدوش کھڑا ہوگیا اور اسلام گاندھی جی کی معصوم کند کے ایک جھٹکے میں عرش کی بلندیوں سے تحت الثریٰ کی پستیوں میں آگرا۔ آپ شاید یہ کہہ دیں کہ واہ صاحب! ایک مہاتما گاندھی جی

کے ایسا کہہ دینے سے کیا ہوتا ہے جب کہ خود کانگرس کے اندر اسلام کی برتری اور فوقیت کو ثابت کرنے والی اتنی اتنی بڑی ہستیاں موجود ہیں لیکن جب آپ گاندھی جی کی نگہ دوررس کی حقیقت سے واقف ہو جائیں گے اور کانگرس کے محافظینِ اسلام آپ کے سامنے بے نقاب آئینگے تو اسوقت آپکو معلوم ہوگا کہ اسلام کی فوقیت اور برتری ثابت کرنے والے کہاں ہیں! مہاتما گاندھی نے جو بات دس سال بعد زبان پر لانی ہوتی ہے اس کی بنیاد وہ آج رکھ دیتے ہیں۔ پھر وہ ایسی کچی گولیاں بھی کھیلے ہوئے نہیں ہیں کہ مسلمانوں کی ہلاکت و بربادی کے جال وہ کھلے بندوں اپنے ہاتھوں سے بچھاتے پھریں انھوں نے اپنے اُستادان سیاست سے یہ سبق سیکھ رکھا ہے کہ حرم کعبہ کے اندر ترکوں کے سینہ کو گولیوں کا نشانہ بنانے کے لئے کسی غیر کو نہ بھیجو۔ بلکہ خود وہیں کوئی "شریف حسین" تیار کرو۔ لہٰذا گاندھی جی بھی مسلمانوں کی ہلاکت کے لئے مسلمانوں ہی کو تیار کرتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد ۱۹۱۲ء سے ایک تفسیر قرآن لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے کئی دفعہ اُسکے لئے چندے ہوئے اور کئی مرتبہ اُسکے مسودے گم ہوئے، وہ تفسیر نہ چھپنی تھی اور نہ چھپ سکی، حتےٰ کہ انھوں نے تحریر کا شغلہ کم و بیش چھوڑ دیا۔ اور اپنی توجہات دوسری طرف منعطف کرلیں لیکن ہم نے دیکھا کہ ۱۹۳۱ء میں جب کہ وہ پکے نیشنلسٹ ہو چکے تھے۔ اُن کی تفسیر ترجمان القرآن کی پہلی جلد چھپ کر سامنے آگئی، اس تمام تفسیر کو تو کس طرح آپ کے سامنے لایا جائے۔ البتہ انھوں نے تفسیر کے مقدمہ (یعنی تفسیر سورۂ فاتحہ کے ضمن میں ملخصاً بیان کیا ہے کہ اسلام کیا ہے۔ یعنی انھوں نے اپنی تمام تفسیر کو (SUMUP) کیا ہے، یہ (SUMMARY) قابل ملاحظہ ہے۔ دینِ الٰہی کو سامنے رکھیے، برہمو سماج کے عقائد پر نگاہ ڈالیے، پھر گاندھی جی کے نظریۂ مذہب کو سامنے رکھیے۔ اور اسکے بعد مولانا آزاد کی دین کی تشریح پڑھیے، ساری حقیقت آپکے سامنے روشن ہو جائے گی۔ یہ بتانے کے بعد کہ مختلف مذہبی گروہوں نے دین کے سمجھنے میں کیا کیا غلطیاں کیں۔ اسلام کے متعلق ارشاد ہے۔

"لیکن قرآن کریم نے نوعِ انسانی کے سامنے مذہب کی عالمگیر سچائی کا اصول پیش کیا۔

(الف) اس نے نہ صرف یہی بتلایا کہ ہر مذہب میں سچائی ہے۔ بلکہ صاف صاف

کہہ دیا کہ تمام مذاہب سچے ہیں اس نے کہا کہ دین خدا کی بخشش ہے اس لیے ممکن نہیں کہ کسی ایک قوم اور جماعت ہی کو دیا گیا ہو اور دوسروں کا اس میں کوئی حصہ نہ ہو۔

(ب) اس نے کہا خدا کے تمام قوانین فطرت کی طرح انسان کی روحانی سعادت کا قانون بھی ایک ہی ہے اور سب کے لیے ہے، پس پیروان مذاہب کی سب سے بڑی گمراہی یہ ہے کہ انھوں نے دین الٰہی کی وحدت فراموش کرکے الگ الگ گروہ بندیاں کرلی ہیں اور ہر گروہ بندی دوسری گروہ بندی سے لڑ رہی ہے۔

(د) اس نے بتلایا کہ ایک چیز دین ہے ایک شرع و منہاج ہے، دین ایک ہی ہے اور ایک ہی طرح سب کو دیا گیا ہے البتہ شرع و منہاج میں اختلاف ہوا اور یہ اختلاف ناگزیر تھا کیونکہ ہر عہد اور ہر قوم کی حالت یکساں نہ تھی اور ضروری تھا کہ جیسی جس کی حالت ہو ویسے ہی احکام و اعمال اسکے لیے اختیار کیے جائیں، پس شرع و منہاج کے اختلاف سے اصل دین مختلف نہیں ہو جا سکتے تم نے دین کی حقیقت تو فراموش کر دی ہے محض شرع و منہاج کے اختلاف پر ایک دوسرے کو جھٹلا رہے ہو۔

(ﮬ) اس نے بتلایا کہ تمہاری مذہبی گروہ بندیوں اور انکے ظواہر و رسوم کو انسانی نجات و سعادت میں کوئی دخل نہیں۔ یہ گروہ بندیاں تمہاری بنائی ہوئی ہیں ورنہ خدا کا ٹھہرایا ہوا دین تو ایک ہی ہے۔ وہ دین حقیقی کیا ہے؟ وہ کہتا ہے ایک خدا کی پرستش اور نیک عمل کی زندگی۔ جو شخص بھی ایمان اور نیک عمل کی زندگی اختیار کرے گا اسکے لیے نجات ہے خواہ وہ تمہاری گروہ بندیوں میں داخل ہو یا نہ ہو۔

(و) اس نے صاف صاف لفظوں میں اعلان کر دیا کہ اس کی دعوت کا مقصد اسکے سوا کچھ نہیں کہ تمام مذاہب اپنی مشترکہ اور متفقہ سچائی پر جمع ہو جائیں، وہ کہتا ہے تمام مذاہب سچے ہیں لیکن پیروان مذاہب سچائی سے منحرف ہو گئے

ہیں۔ اگر وہ اپنی فراموش کردہ سچائی از سرِ نو اختیار کرلیں تو میرا کام پورا ہو گیا اور انھوں نے مجھے قبول کرلیا۔ تمام مذاہب کی یہی مشترکہ اور متفقہ سچائی ہے جسے وہ "الدین" اور "الاسلام" کے نام سے پکارتا ہے"۔ (ترجمان القرآن۔ جلد اول صفحہ ۱۶۲۔۱۶۳)

*

حقیقی اسلام

اس میں شبہ نہیں کہ اسلام کا یہ دعوے ہے ۔ اور تمام مذاہبِ عالم میں صرف اسلام ہی کا دعویٰ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے دنیا کی ہر قوم میں اپنے رسول بھیجے جو خدا کا پیغام ازلی لوگوں تک پہونچاتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی اس کا یہ بھی دعوے ہے ۔ اور کس قدر حقیقت پر مبنی دعویٰ ۔ کہ وہ سچائیاں ۔ وہ پیغام ازلی ۔ وہ دینِ خداوندی ۔ دنیا میں کسی قوم کے پاس باقی نہ رہا، یا تو وہ حوادث ارضی و سماوی کی نذر ہو گیا۔ یا انسانی ہاتھوں نے اس میں الحاق وتحریف کردی حق کو باطل کے ساتھ ملا دیا۔ دین کی صورت مسخ ہو گئی ۔ اور اس ضرورت کی بنا پر کہ دنیا میں کہیں خدا کی سچائیاں باقی نہ رہی تھیں ظہرالفساد فی البر والبحر خشکی اور تری میں فساد ہی فساد رونما ہو چکا تھا، خدا نے نبی اکرمؐ کی وساطت سے اپنا پیغام ازلی قرآن کریم کی شکل میں نازل فرمایا جو تمام سابقہ سچائیوں کا مہیمن ہے یعنی جتنی سچائیاں خدا کیطرف سے آتی رہی تھیں پر لوگوں نے انہیں محفوظ نہ رکھا تھا۔ وہ سب اسکے اندر ہیں۔ اور انکے علاوہ وہ تمام اصولِ زندگی جن کی قیامت تک انسانوں کو ضرورت پڑے گی ۔ وہ بھی اسکے اندر ہیں۔ گویا یہ پیغام خداوندی کا مکمل اور آخری ضابطہ ہے الدین اور الاسلام اسکے اندر آکر مکمل بھی ہوا ہے (الیوم اکملت لکم دینکم) اور محفوظ بھی (نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون ۰) اس کی حفاظت خود خدا کے ذمہ ہے ۔ اس ضابطہ کے اجمال کی عملی تفصیل محمد الرسول اللہؐ کا اسوہ حسنہ ہے اور یہ مہماتِ اصول اور ان کی عملی تفصیل مل کر خدا کا سچا مذہب الاسلام بنتے ہیں، لہٰذا آج خدا کے نزدیک جو دین حقیقی ہے جو سچا مذہب ہے، جو سچی شریعت ہے، وہ صرف وہی ہے جو قرآن کریم کے اندر ہے، جو شریعت محمدیہ کہلاتی ہے،

(ان الدین عند اللہ الاسلام) اب سچائیاں اور کہیں نہیں۔ اگر سچائیاں کہیں اور بھی ہوتیں تو قرآن کریم نازل کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ یہ تو نازل ہی اس لئے ہوا تھا کہ سچائیوں کا وجود دنیا سے گم ہو چکا تھا۔ لہذا آج دنیا کا کوئی مذہب نہ اصول میں نہ شریعت میں اس کے برابر ہو سکتا ہے نہ اس کا بدل (SUBSTITUTE) اور آج الدین اور الاسلام کو ماننے کے معنی یہ ہیں کہ قرآن پر ایمان رکھا جائے اور شریعت محمدیہ کی اتباع کی جائے جو ایسا نہیں کرتا نجات و سعادت کا قطعاً مستحق نہیں ہے۔ یہ قرآن کریم کا دعوےٰ ہے، اگر کسی کو اس میں ذرا بھی شک ہو تو وہ ہمیں اطلاع دے۔ ہم قرآن کریم کی نصوص صریحہ سے ایسے واضح طور پر ثابت کر کے دکھا دینگے۔ اس حقیقت کو سامنے رکھیئے اور پھر مولانا آزاد کی تفسیر کے مندرجہ صدر ٹکڑوں پر نگاہ ڈالیئے۔

(الف) وہ فرماتے ہیں کہ:۔ ہر مذہب میں سچائی ہے، تمام مذہب سچے ہیں۔ قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ ہر مذہب میں سچائی تھی۔ تمام مذاہب سچے تھے لیکن قرآن کریم کے نزول کے وقت وہ سچائیاں گم ہو چکی تھیں۔ لہذا آج سچائیاں صرف قرآن کے اندر ہیں دنیا میں اور کہیں نہیں ہیں +

(ب) مولانا فرماتے ہیں کہ پیروان مذاہب کی سب سے بڑی گمراہی یہ ہے کہ انہوں نے اپنی گروہ بندیاں بنالی ہیں لیکن قرآن کریم مسلمانوں کو ایک الگ گروہ قرار دیتا ہے انہیں حزب اللہ (خدا کا گروہ) کہتا ہے[1]۔ انہیں خیر امت اور امت وسطیٰ کے القاب سے یاد کرتا ہے (یعنی بہترین جماعت بہترین قوم) لہذا مسلمانوں کا الگ گروہ قایم رہنا ان کی گمراہی نہیں۔ بلکہ انکے خدا کا حکم ہے +

(د) یہ درست ہے کہ دین ایک چیز ہے اور شرع و منہاج دوسری چیز لیکن یہ غلط ہے کہ دین (سب جگہ) ایک ہی ہے اصل یہ ہے کہ دین ایک ہی طرح سب کو دیا گیا تھا۔ لیکن لوگوں نے اس کو بدل ڈالا۔ اور اب وہ صرف قرآن کریم کے اندر ہے۔

---

[1] "خدائے تعالیٰ نے مومنین مخلصین کو حزب اللہ کے لقب سے ملقب فرمایا ہے" (مولانا آزاد الہلال ۱۹۱۳ء ۲)

پھر یہ بھی درست نہیں کہ شرع و منہاج کا اختلاف یونہی معمولی سی بات ہے شرع و منہاج وہ شے ہے جس کی خاطر رسول پر ایمان لانا پڑتا ہے بحکم خداوندی اس کی اتباع کرنی پڑتی ہے۔ اور چونکہ شرع عملی تفصیل ہوتی ہے اصول دین کی۔ اس لیے جب اسوقت دین وہی دین ہے جو رسول اللہ صلعم لائے تو شریعت بھی وہی شرع ہے جو اُن کی وساطت سے ملی۔ نہ دین کہیں اور سے مل سکتا ہے نہ شریعت ہی غیر اہم شے ہے +

(۲) جیسا کہ (ج) میں بتایا جاچکا ہے یہ قطعاً دہوکا ہے کہ مسلمانوں کی "گروہ بندی" اِن کی اپنی بنائی ہوئی ہے، یہ خدا ہی کی بنائی ہوئی ہے، لہٰذا نجات وسعادت کے لیے متبعین محمد الرسول اللہ کی جماعت میں شامل ہونا ازبس ناگزیر ہے، پھر یہ بھی غلط ہے کہ "ظواہر و رسوم" کو نجات وسعادت میں کوئی دخل نہیں۔ ظواہر و رسوم (مثلاً عبادت کے طریقے۔ حرام وحلال کا فرق) شریعت کہلاتے ہیں اور شریعت دین ہی کی تفسیر کا نام ہے، "خداپرستی اور نیک عملی" کے الفاظ بالکل مہمل ہیں اگر اُن کی تشریح قرآن کریم کی رو سے نہ کیجائے، قرآن کریم کی رو سے "خدا پرستی" وہی خداپرستی ہوسکتی ہے جو قرآن کریم کے متعین کردہ ایمان کے مطابق ہو۔ اور اعمال وہی نیک قرار پاسکتے ہیں۔ جن کو اُسنے نیک اعمال کہا ہو +

(ذ) یہ قطعاً غلط ہے کہ قرآن کہتا ہے کہ تمام پیروان مذاہب سچے ہیں۔ وہ صرف اتنا کہتا ہے کہ اپنے اپنے وقت میں مذاہب سب سچے تھے، لہٰذا پیروان مذاہب اگر آج "فراموش کردہ سچائی" کو ازسرنو اختیار کرنا چاہیں تو سچائی چونکہ دُنیا میں اور کہیں نہیں۔ اِس لیے انہیں قرآن کریم پر ایمان لانا ہوگا۔ شریعت محمدیہ کی اتباع کرنی ہوگی۔ اور اس طرح مسلمانوں کے گروہ میں شامل ہونا پڑے گا۔ یہ ہے آج "الدین" اور "الاسلام"۔ یہ ہم نہیں کہتے۔ خود مولانا آزاد بھی اپنے دورِ قومیت

کونوامع الصادقین (سچوں کے ساتھ رہو)

پرستی سے پیشتر یہی کہا کرتے تھے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جہاں فرمایا ہے کہ جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کی تلاش کرے گا تو وہ دین قبول نہ کیا جائے گا۔ اس آیت کا ترجمہ ۱۹۱۳ء میں یوں کیا جاتا تھا۔ ۳:۸۴

ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ وھو فی الآخرۃ من الخاسرین

اب سے جو انسان احکام اسلامی کی جگہ کسی دوسری تعلیم کو تلاش کرے گا تو یقین کرو اس کی تلاش کبھی مقبول نہ ہوگی اور اُسکے تمام کاموں کا آخری نتیجہ ناکامی و نامرادی ہوگا۔ (الہلال ۲۴/۹)

لیکن اسی آیت کا ترجمہ دَورِ قومیت پرستی کے بعد یوں کیا جاتا ہے:۔

"اور جو کوئی اسلام کے سوا (جو عالمگیر سچائی اور تصدیق کی راہ ہے) کوئی دوسرا دین چاہے گا .... (ترجمان القرآن جلد اول ص۱۵۸)

اور اس "عالمگیر سچائی" کی تشریح آپ پڑھ چکے ہیں۔ ۱۹۱۳ء میں "الاسلام" نام تھا احکام اسلامی کا، اور ۱۹۳۱ء میں وہ نام ہو گیا اس "عالمگیر سچائی" کا جو ہر مذہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہے حالات کے بدلنے سے آیات کے ترجمے تک بدل گئے۔

اس تفسیر کا اثر

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ وہی چیز جو کبھی دینِ الٰہی کی شکل میں سامنے آئی تھی۔ پھر وہ برہمو سماج کے رنگ میں نمودار ہوئی۔ اور جسے اب مہاتما گاندھی تعلیمی نصاب میں پیش کر رہے ہیں لفظاً لفظاً وہی ہے جو مولانا آزاد نے اپنے دَورِ قومیت پرستی کی تفسیر میں بیان فرمائی ہے یعنی تمام مذاہب اپنی بنیادی سچائیوں کے اعتبار سے یکساں ہیں۔ فرق شریعتوں میں ہے اور شریعتیں کچھ اہمیت نہیں رکھتیں اِس بات کے اعلان کے لیے مہاتما جی نے اتنا عرصہ پیشتر سے زمین ہموار کرنا شروع کر دی تھی، چنانچہ ۱۹۳۱ء میں جب یہ تفسیر شائع ہوئی ہے تو مہاتما گاندھی نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایک تقریر فرمائی

اور اس میں کہا کہ مجھے ایک عرصہ سے خیال تھا کہ اسلام ایسا تنگ نظر مذہب نہیں ہو سکتا کہ وہ نجات سعادت اپنے پیرواں تک ہی محدود رکھے اور سچائیاں اپنے اندر ہی بتلائے لیکن مجھے اس بات کی سند کہیں سے نہ ملتی تھی۔ اب جو مولانا آزاد نے تفسیر شائع کی ہے تو مجھے اپنے اس خیال کی سند مل گئی ہے کہ اسلام تمام مذاہب میں یکساں سچائیوں کا مدعی ہے۔ لہٰذا ہم نے اس تفسیر کے متعلقہ ٹکڑوں کا (ہندی) میں ترجمہ کر کے عام شائع کرایا ہے[۱]، اس کے بعد پانچ چھ برس تک مختلف قومیت پرست مسلمانوں کیطرف سے اسی اسلام کا اعلان ہوتا رہا۔ ان کی طرف سے مضامین شائع ہوتے رہے تقریریں ہوتی رہیں۔ جب یوں میدان صاف ہو گیا تو اب مہاتما جی نے اس نظریہ کو اپنی تعلیمی اسکیم میں شامل کر دیا۔ اگر اتنی زمین ہموار کئے بغیر۔ پہلے ہی یہ نظریہ مہاتما جی کی طرف سے پیش ہوتا تو مسلمان بدک جاتے لیکن مہاتما جی نے نہایت "حسنِ تدبیر" اپنی مخصوص شاطرانہ چالوں سے مسلمانوں کے ذہن کو اس کے قبول کرنے کے لیے تیار کرایا۔ اور اس کے بعد اس کا اعلان کیا۔ نتیجہ اسکا یہ ہے کہ آج خود مسلمان اس اسکیم پر احسنت و مرحبا کے نعرے لگا رہے ہیں۔ آپ کے قوم پرست علماء حضرات۔ جو آمین بلند دآبستہ کہنے پر ایک دوسرے کو کافر بناتے رہتے ہیں۔ جن کے نزدیک دین کی جزئیات کی اتنی اہمیت ہے کہ وہ ٹخنوں سے نیچے پاجامہ پہننے والے کو نجات وسعادت سے محروم قرار دیتے ہیں وہ آج اسلام کی اس جدید تعریف (DEFINITION) کی رو سے اس شخص کو جسے کل تک وہی "کافر و مشرک" کہا کرتے تھے۔ اسی طرح نجات وسعادت کا مستحق قرار دیتے ہیں جس طرح مسلمان کو۔ بلکہ مسلمان کو وہ کھلی ہوئی گمراہی میں سمجھتے ہیں کہ یہ اپنی "مذہبی گروہ بندی" الگ قایم رکھنا چاہتا ہے۔ اور ہندو ان کے نزدیک صحیح اسلام کا پیرو ہے جو ان گروہ بندیوں کو توڑ کر ایک متحدہ قومیت بنانا چاہتا ہے۔

ذرا خدا کے لئے پوچھیے کسی عالم سے، پوچھیے کسی فقیہہ سے، پوچھیے کسی مولانا سے، پوچھیے کسی امیر شریعت سے۔ کہ کیا فی الواقع اسلام وہی ہے جو مولانا آزاد نے اپنی تفسیر میں پیش کیا ہے؟ کیا ہندو مت اور اسلام واقعی اپنی بنیادی سچائیوں کی رُو سے بالکل یکساں ہیں؟ کیا مذاہب کے ظواہر و رسوم "فی الحقیقت بیکار" ہیں کہ بچوں کو جن کی تعلیم دینا انہیں اصل

---

[۱] مسٹر بہادیو ڈیسائی سے ہمیں اطلاع ملی ہے کہ مولانا آزاد کی اس تفسیر کا ہندی ترجمہ بابو راجندر پرشاد (پٹنہ) سے مل سکتا ہے۔ "طلوع اسلام"

دین سے بیگانہ کردیتا ہے ؟ کیا واقعی شریعتِ محمدیہ کو نجات وسعادت میں کوئی دخل نہیں ؟ پوچھئے
ان سے کہ آج اُن کی اِس حمیتِ دینی کو کیا ہوا جو شریعت کے ذرا اختلاف کو برداشت نہ کرسکتی تھی !
دریافت کیجئے ان سے کہ ان کے فتاوی کی ان مہروں کو کون چُرا کرلے گیا جو "ظواہر و رسوم" کے اختلافات
کے فیصلوں کے لیے ہر وقت سجدہ ریز رہا کرتی تھیں ! کس نے اُنکے قلموں کی سیاہیاں خشک کردیں
کیا چیز آج انکے گلوگیر ہوگئی . کہ یہ سب کچھ دیکھتے ہیں لیکن نہ کچھ لکھ سکتے ہیں نہ بول سکتے ہیں . آپ ایکدفعہ
تسلیم کرلیجئے کہ سچائیاں . جو اصلِ دین ہیں ہر مذہب میں یکساں ہیں . اور شرائع جن میں اختلاف ہے
وہ کچھ اہمیت نہیں رکھتیں . پھر اپنے آپ سے سوال کیجئے کہ یہ جو آپکے عُلما حضرات منبروں اور اسٹیجوں پر اسلام
کی خصوصیات پر خطبے اور لکچر دیتے ہیں . اسکے کیا معنی رہ جاتے ہیں . کیا یہ سب کچھ ، بقول مہاتما گاندھی ،
اس لیے نہیں کیا جاتا کہ آپ محض سیاسی اغراض کیخاطر غیر مسلموں کو مسلمان بنانے کی کوشش کرتے ہیں
پھر پوچھئے کہ جب آپ کے بچوں کو کامل سات برس تک جبری طور پر اس عقیدہ کی تعلیم دی جائیگی
تو اُن کے نزدیک اسلام میں کون سی کشش باقی رہ جائے گی جس کی خاطر وہ اس سے متمسک رہیں . وہ
بچہ جب ہندوؤں کو بھی اسی قسم کی سچائیوں کا حامل سمجھے گا جس قسم کی سچائیاں قرآن کریم میں ہیں . تو وہ پھر
ہندو قوم میں شامل کیوں نہ ہو جائے گا . جس کے پاس مسلمانوں سے کہیں زیادہ دھن دولت ہوگا
لاکھوں بھنگی اور چمار (اچھوت) عیسائیوں کی "مکتی فوج" میں اس لیے شامل ہوگئے کہ (۱) ان کے اپنے
مذہب میں انہیں کوئی تفوق نظر نہیں آتا تھا اور (۲) جس مذہب کی انہیں دعوت دی جاتی تھی وہ
حاکم قوم کا مذہب تھا . کیا یہی چیز مسلمان بچوں کے ساتھ بھی نہ ہوگی . سوامی شردھانند کی تحریک شدھی
تو یونہی بدنام ہوگئی کہ وہ کھلے بندوں نام لے کر شدھی ہوتی تھی . مہاتما جی اُسوقت ہنستے ہونگے کہ
کیا دورِ جہالت کا سا طریقِ عمل اختیار کیا گیا ہے مسلمانوں کو شدھ کرنے کا طریقہ اس سے جداگانہ ہے
انھوں نے اُسی زمانہ سے خاموش شدھی کی اسکیم کا خاکہ تیار کرلیا جس کا سنگِ بنیاد مولانا آزاد
کے مقدس ہاتھوں سے رکھوایا گیا . اور اب اس پر عمارت کھڑی کی جارہی ہے -
کہا جاسکتا ہے کہ مسلمان اپنے بچوں کو مذہبی تعلیم نجی طور پر دلا ئیں لیکن ذرا اس پر بھی غور

فرمایئے کہ اسکول میں تو اسے پڑھایا جائے گا کہ تمام مذاہب اصولی طور پر یکساں ہیں اور گھر پہ اسے پڑھایا جائے گا کہ اسلام دیگر مذاہب سے بلند و بالاتر مذہب ہے بلکہ خدا کا سچا مذہب ہے یہی نہیں بلکہ پھر اسے گھر پہ شریعت کی تعلیم بھی دی جائے گی اور یہ وہ تعلیم ہوگی جس کی نسبت مہاتما جی نے فرمایا ہے کہ تمام لڑائی جھگڑوں کا باعث ہی یہ تعلیم ہے۔ تو یہ دونوں باتیں ساتھ ساتھ کیسے چلیں گی یہ بھی واضح رہے کہ اسکولوں میں مذہبی تعلیم کتابوں کے ذریعے سے نہیں ہوگی اس لیے کہ مہاتما جی کو خوب علم ہے کہ وید کسی طرح قرآن کے سامنے لائے ہی نہیں جا سکتے تعلیم ہوگی استادوں کی زندگی کے ذریعہ سے۔ اور ظاہر ہے کہ کانگریسی حکومت کے مقرر کردہ استاد کوئی ڈاکٹر اشرف کوئی جوش ہی ہونگے جہاں وزیر تعلیم ڈاکٹر سید محمود جیسے ہونگے جو مسلمان کا سا الگ نام رکھنا بھی ہندی قومیت کے خلاف سمجھتے ہیں۔ وہاں کے استاد جس ڈہنگ کے ہوں گے وہ ظاہر ہے۔

باب دوم
فلسفۂ زندگی

مذہب کے متعلق تو آپ دیکھ چکے اب فلسفۂ حیات کو لیجیے مسلمانوں کے نزدیک فلسفۂ زندگی مذہب سے الگ شے نہیں۔ یوں سمجھیے کہ مذہب جس رنگ میں انسان کو رنگنا چاہتا ہے۔ وہ اس کا فلسفۂ زندگی ہوتا ہے۔ ہندو لیگیوں کا فلسفۂ حیات اہمسا ہے۔ جسکے معنی عدم تشدد (NON VIOLENCE.) کیے جاتے ہیں لیکن عدم تشدد سے اس کا صحیح مفہوم ذہن میں منتقل نہیں ہوسکتا۔ اس سے مفہوم وہ فلسفۂ زندگی ہے جو حضرت مسیح کیطرف منسوب کیا جاتا ہے یعنی جو ایک گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا گال بھی سامنے کر دو۔ ماحصل یہ کہ ہمیشہ مار کھائے جاؤ لیکن سامنے سے ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ جب ہاتھ اٹھاؤ گے تو وہ ہِمسا ہو جائے گا کہ قوت طاقت کا استعمال ہمسا ہے اور مار کھاتے جانے کا طرز عمل اہمسا ہے۔ یہ وہ فلسفہ ہے

ص۱ (ملاحظہ ہو سوراجی اسلام مطبوعہ طلوع اسلام بابتہ جون)

جس کے اوتار آج مہاتما گاندھی سمجھے جاتے ہیں۔ اور وہ اس فلسفہ کو انسانیت کی بہترین تعلیم قرار دیتے ہیں۔ وارد ہا اسکیم جیسے متعلق دعوےٰ یہ ہے کہ اس کو مذہب سے کچھ علاقہ نہیں فلسفۂ زندگی کے اعتبار سے اُس کی بنیاد اہنسا پر رکھی گئی ہے، چنانچہ رپورٹ زیرِ بحث میں سب سے مقدم "بنیادی اصول" کے ماتحت لکھا ہے کہ "ہمارے بچوں کو یہ سکھانے کی ضرورت ہے کہ اہنسا کا طریقہ ہنسا سے اچھا ہے" (رپورٹ صا۱۱) پر سپھر سماج" کے علم" کے عنوان میں درج ہے۔

> جن لوگوں نے قوموں کو آزاد کرایا ہے اور امن کے ذریعہ سے صلح حاصل کی ہے ان کی کہانیاں کورس کی کتابوں میں خاص طور پر ہونی چاہئیں۔ انسانوں کی زندگی سے ایسے سبق سکھانے چاہئیں جن سے اہنسا اور اس کے ساتھ کی خوبیوں کا ہنسا، دھوکے اور دغا سے اچھا ہونا ثابت ہو۔ (ص۱۱۹)

ہنسا یا اہنسا

ہمیں دیکھنا ہے کہ کیا قرآن کریم کی رُو سے۔ اُسوۂ حسنہ کی رُو سے صحابہ کبار کی حیات مقدسہ کی رُو سے، مسلمان کے لیے فلسفۂ زندگی یہی ہے جس کی تعلیم جبراً ان کے بچوں کو دی جائے گی۔ اس میں شبہ نہیں کہ اسلام امن وسلامتی کا مذہب ہے، وہ خواہ مخواہ دوسروں کو ستانے کی تلقین نہیں کرتا بلکہ اس سے بڑی سختی سے روکتا ہے، وہ اپنے بیگانے سب کی عزت، عصمت، جان، مال، مذہب کی حفاظت کرنا سکھاتا ہے اور اس کے لیے وہ بُرائی کو بھلائی سے روکنے کا سبق دیتا ہے۔ (ادفع بالّتی ھی احسن) لیکن اس کے نزدیک صرف اتنا حصہ فلسفۂ زندگی کا ایک شعبہ ہے، زندگی صحیح فطرتِ انسانی کے مطابق نہیں ہوسکتی تاوقتیکہ اس عاجزی اور نرمی کے حصہ کے ساتھ دوسرا حصہ۔ اور نہایت اہم حصہ بھی شامل نہ ہو یعنی وہ کہتا ہے کہ دُنیا میں عفو، درگذری، نرمی، لینت رواداری بڑے عمدہ اصول ہیں۔ لیکن جب ایسا وقت آجائے کہ شریر النفس انسان دوسروں کی شرافت سے ناجائز فائدہ اٹھائیں اور کمزوروں اور ناتوانوں پر خدا کی یہ وسیع وعریض زمین تنگ کردیں، جب ایسا وقت آجائے کہ نرمی اور عاجزی، عفو اور درگذری سے ظالم کی سرکشی۔ اس کا ظلم واستبداد اور بڑھتا چلا جائے

تو اس وقت یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ دُنیا میں عدل و انصاف قائم رکھنے کے لیے، قوانین الٰہی کی محافظت کے لیے، ظالم کے ظلم کو قوت سے روکو۔ اور اُس کی سرکشی اور دراز دستی کو پُوری طاقت اور زور کے ساتھ کچل کے رکھ دو۔ اُسکے تکبر و نخوت، اس کی فرعونیت اور نمرودیت کو چور چور کر دو کہ الفتنۃ اشد من القتل۔ فتنہ و فساد، ظلم و استبداد، سرکشی اور تظلم قتل سے کہیں زیادہ شرانگیز ہے۔ کہ جس انگلی پر ایسا ناسور ہو جائے، جو ناقابل علاج ہو۔ اور اس کے زہر کا سارے جسم میں پھیل جانے کا اندیشہ ہو تو اس انگلی کا کاٹ کر پھینک دینا ہی عین مصلحت ہے۔ اگر آپ کو مظلوم کی حفاظت مقصود ہے تو ظالم کے ظلم کو ہر طرح سے روکنا ہوگا۔ اگر پُرامن انسانوں کی عزت، عصمت، جان، مال کا تحفظ مطلوب ہے، تو قاتلوں کو دار و رسن کرنا ہوگا۔ مجرموں کو سزائیں دینی پڑیں گی، عدل و انصاف قائم کرنے کے لیے محکمۂ عدالت ناگزیر ہے اور محکمۂ عدالت کے قیام و بقا کے لیے شمشیرِ جگرِ دار کا ساتھ ہونا بھی لاینفک ہے۔ کوئی قانون ایسا نہیں جو دُنیا میں قوت کے بغیر نافذ العمل ہو سکتا ہو۔ قرآن کریم نے اسی حقیقتِ کبریٰ کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ ۲۵/۵۷

ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا اور انکے ساتھ کتابیں یعنی قوانین عدل و انصاف نازل کیے تاکہ لوگ اپنے ٹھکانے پر اعتدال سے رہیں۔ اور ان کے ساتھ ہی ہم نے فولادی شمشیر (لوہے) کو بھی نازل کیا جس میں سخت قوتوں (کے راز) پوشیدہ ہیں اور لوگوں کے لیے (اور بھی) فائدے ہیں، تاکہ اللہ دیکھ لے کہ کون اس کی اور اسکے رسولوں کی بلا دیکھے مدد کرتا ہے۔ یقیناً اللہ بڑی قوت والا۔ زبردست (غالب) ہے

حضرت علامہؒ فرماتے ہیں۔

سوچا بھی ہے اے مردِ مسلماں کبھی تو نے ÷ کیا چیز ہے فولاد کی شمشیرِ جگر دار
اس بیت کا یہ مصرعہ اول ہے کہ جس میں ÷ پوشیدہ چلے آتے ہیں توحید کے اسرار

خدا کی کتاب یعنی قوانین الٰہی کے ساتھ ساتھ تلوار بھی نازل ہوئی ہے کہ لوگوں کو ٹھیک اپنے ٹھکانے پر رکھا جائے، جاوید نامہ میں حضرت علامہؒ خاتونِ محترمہ شرف النساء کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ اُسنے وصیت کی تھی کہ اس کی قبر پر تلوار اور قرآن رکھ دیا جائے کہ :۔

این دو قوت[1] حافظ یکدیگر اند ÷ کائناتِ زندگی را محور اند ÷
مومناں را تیغ با قرآں بس است ÷ تربت ما را ہمیں ساماں بس است

آیت کے اخیر میں فرمایا کہ مسلمانوں کا خدا قوی عزیز ہے۔ بے انتہا قوتوں کا مالک اور غالب زبردست اس لئے اسکے رنگ میں رنگی ہوئی قوم بھی قوت وسطوت کی مالک ہونی چاہیئے۔ اہنسا کی پرستار تو اس خدا کی قوم ہوسکتی ہے جو اسدرجہ بے بس اور مجبور ہو کہ اسپر کوئی پتھر بھی پھینک دیا جائے تو وہ ہاتھ نہ اٹھا سکے، مٹی کے بت اور ایک خدائے حیؒ وقیوم میں جتنا فرق ہے، اتنا ہی فرق اہنسا کے اوتارؑ اور ایک مردِ مجاہد میں ہے۔ مسلمان کا ہیولےٰ تو اہنسا اور ہنسا دونوں سے ملکر بنتا ہے ۔

قہاری وغفاری وقدوسی وجبروت ÷ یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان!

نبی اکرمؐ نے عفو ودرگذری کا جو نمونہ اپنی حیاتِ مقدسہ میں پیش کیا اس کی نظیر دُنیا کے کسی بڑے سے بڑے مدعیٔ امن وصلح کے ہاں نہیں مل سکتی لیکن اس کے ساتھ ہی جب قوت اور طاقت کے استعمال کی ضرورت پڑی تو کم وبیش (۸۰) لڑائیوں (مغازی وسرایا) میں خود بدست شریک ہوئے، یا ان قدوسیوںؓ کی جماعت کو روانہ فرمایا ... جو دُنیا میں انسانیت کے معراج کبریٰ کے مظہر اتم

[1] تلوار قرآن کریم کی حفاظت کرنے والی ہے، یہ تو ظاہر ہے۔ لیکن نکتۂ بلیغ یہ ہے کہ قرآن کریم بھی تلوار کا محافظ ہے تلوار کو اس محافظ کے بغیر آزاد چھوڑ دیا جائے۔ تو وہ تلوارِ چنگیز خاں۔ ہلاکو۔ چنگیز۔ ہٹلر اور مسولینی بن جاتی ہے لیکن جب اس کے ساتھ قرآن محافظ ہو تو یہ عمرؓ وخالدؓ کی صورت اختیار کرتی ہے۔ اور دونوں میں فرق ظاہر

تھے۔ وہ مسلمان جن کے متعلق قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۚ
يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ ۞ ٩/١١١

بے شک اللہ نے مومنین سے بعوض جنت اُن کی جانیں اور اموال خرید لیے ہیں اور
(اس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ) وہ لوگ اللہ کے راستے میں (میدان جنگ میں) لڑتے
ہیں۔ سو یا تو دشمن کو تہ تیغ کر کے (فاتح و مظفر لوٹتے ہیں) یا وہیں خاک و خون میں
غلطاں ہو کر رسم شہادت کی بنیاد ڈالتے ہیں۔

مومن کی تو شان یہ ہے کہ اگر دُنیا قوانین الٰہی کے مطابق نہ چلے تو اس دُنیا کو زیر و زبر کر دے۔
اس زمین و آسمان کو الٹ دے۔ اس جہانِ آب و گل کو درہم برہم کر دے۔

گفتند جہانِ ما۔ آیا بتو می سازد گفتم کہ نمی سازد۔ گفتند کہ درہم زن۔

مومن دُنیا میں پانی کی طرح ہر قالب میں ڈھل جانے کے لیے نہیں پیدا ہوا۔ بلکہ یہ تو دُنیا والوں کو اپنے
خدا کے وضع کردہ قالب میں ڈھالنے کے لیے پیدا ہوا ہے اگر وہ پانی ہے تو خود بخود اس کے قالب میں
ڈھل جائے گا۔ اور اگر لوہا ہے تو اُسے یہ اپنے جلال کی آتشِ سوزاں میں پگھلائے گا۔ تاآنکہ وہ نرم
بنکر اسکے قالب میں ڈھل جائے۔ یہ دُنیا میں قوانین الٰہی کا نافذ کرنیوالا ہے۔ اگر شریف النفس انسان
اُسے نرمی اور محبت سے مان لیں تو اس سے بڑھ کر مہربان کوئی نہ ہو گا لیکن اگر سرکش اور ضدی انسان
اس قانون سے بغاوت کرے تو اس جیسا سخت گیر کوئی نہ ہوگا۔ مومن وہ ہے کہ:۔

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم *
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

محمد الرسول اللہ وَالَّذِينَ معہٗ۔ اشداء علی الکفار رحماء بینہم

اہنسا کا فلسفہ تو انکا ہے جو آسمان میں بجلی کڑکی تو اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے، بادل گرجا تو
اُسکے سامنے سجدہ میں جھک گئے، سانپ دیکھا تو ڈنڈوت کرنے لگے، اپنے ہاتھوں سے بُت تراشا کر

اُسے خدا بناکر بیٹھ گئے لیکن جو اس تمام کائنات کو مسخر کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہو۔ وہ ایسا کا پرستار کیسے ہو سکتا ہے (وسخر لکم ما فی السموات والارض جمیعا) ایسا نروان کا فلسفہ ہے کہ جنہوں نے جب سے آنکھ کھولی اپنے آپ کو دوسروں کا غلام ہی دیکھا لیکن جو بارہ برس کے اندر چالیس ہزار شہر اور قلعے فتح کرنے والی قوم ہو اس کو صرف اہنسا سے کیا واسطہ۔ نبی اکرمؐ سے دریافت کیا گیا کہ مومن کی زندگی کیا ہے۔ فرمایا کہ جب جہاد ہو رہا ہو تو وہ میدان جنگ میں ہو۔ اور جب نہ ہو رہا ہو تو اس کی تیاری میں مصروف ہو۔ میدانِ جہاد کا نقشہ تو آپنے آیت مندرجہ صدر (ویقتلون ویقتلون) میں دیکھ لیا۔ تیاری میں مصروف رہنے کے متعلق ارشاد ہے۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ...... ۞

اور جس قدر قوت (وسامان) تم سے ہو سکے اس سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے تم اپنے اور اللہ کے دشمنوں (کے مقابلہ) کی تیاری رکھو تاکہ (اس قوت وشوکت سے) اُن پر تمہارا رعب قایم رہے۔

کہیے کہ وہ قوم جس کا رازِ حیات ان احکام کے اندر پوشیدہ ہو۔ اس کا فلسفۂ زندگی اہنسا ہو سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کا یہ فلسفۂ زندگی جس میں جمال کے ساتھ جلال کا عنصر بھی شامل ہے غیر مسلموں کے دل میں ہمیشہ سے کھٹکتا رہا ہے۔ کوئی ڈاکو کسی کوتوال کو اچھا نہیں سمجھ سکتا۔ اس لیے انھوں نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ اس فلسفۂ زندگی کو گھناؤنا بناکر دکھایا جائے اس کی ایسی تصویر کھینچی جائے کہ جو دیکھے، اس سے نفرت کرنے لگ جائے۔ عیسائی مستشرق ایک عرصہ تک اس کی نشر و اشاعت کرتے رہے ہیں اور اب بھی کر رہے ہیں۔ نتیجہ اس پروپیگنڈا کا یہ ہوا کہ غیر تو غیر خود مسلمان بھی اس قوت وشوکت کے فلسفۂ حیات کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگ گیا۔ گزشتہ پچاس برس سے آپ ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھیے، بالعموم جہاد کے مسئلہ میں وہ کچھ ایسے جھینپے ہوئے سے نظر آئینگے ان کا کچھ ایسا (APOLOGETIC ATTITUDE) ہوگا کہ اول تو ان کی خواہش یہ ہوگی کہ کسی طرح قرآن کریم سے یہ آیتیں خارج ہو جائیں تو اچھا ہے۔ لیکن چونکہ اس پر ان کا بس نہیں چلتا۔

اس لئے وہ آیات کی ایسی مضحکہ انگیز نادلیلیں کرتے ہیں جن سے کسی طرح یہ ثابت ہو جائے کہ یہ اُس زمانے کے احکام ہیں جس میں ابھی دنیا اتنی "مہذب" نہ ہوئی تھی۔ وہ دور وحشت و بربریت تھا۔ یہ احکام وقتی تھے۔ اس زمانے کے مخصوص حالات کے ماتحت عربوں کی اس جنگجو قوم کے مقابلہ میں اس قسم کے طرز عمل کی ضرورت پڑ گئی۔ لیکن اب یہ تمام آیات "منسوخ" ہو چکی ہیں۔ اور اب جہاد صرف "اشتہار نویسی" اور "مناظرہ بازی" کا نام رہ گیا ہے۔ اس پروپیگنڈے کی تکمیل کے لئے قادیان میں ایک "نبی" بھیجا گیا۔ اور اس نے فیصلہ ہی کر دیا کہ جہاد بالسیف اب سے قطعاً ممنوع ہے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ؎

ہو اگر قوت فرعون کی درپردہ مرید
قوم کے حق میں ہے لعنت وہ کلیم اللٰہی

ایک مثال

اس منظم سازش کے متعلق حضرت علامہؒ اپنی مثنوی اسرار و رموز میں تمثیلاً بیان فرماتے ہیں کہ کسی جنگل میں ایک شیر رہتا تھا۔ وہاں کی بھیڑیں جب اس سے تنگ آگئیں تو انہوں نے مل بیٹھ کر مشورہ کیا کہ اس آفت کا علاج کیا کیا جائے۔ ان میں جو سب سے زیادہ سیاست داں بھیڑ تھی اس نے کہا کہ دیکھو بھئی! اگر تم تمام بھیڑیں بھی اکٹھی مل جاؤ تب بھی ایک شیر نہیں بن سکتیں۔ لہٰذا اپنے آپ کو شیر بنانے کا خیال محض وہم ہے البتہ کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ اس شیر کو کسی طرح بھیڑ بنا دیا جائے۔ چنانچہ اس بھیڑ نے گیرڑے رنگ کے کپڑے پہنے۔ ماتھے پر تلک لگایا۔ پاؤں میں کھڑاویں پہنیں۔ اور ایشور بھگتی۔ ایشور بھگتی کا منتر جاپتی ہوئی شیر کی طرف چلی۔ شیر نے دیکھا کہ ایک دیوتا سروپ جہاتما چلا آ رہا ہے ڈنڈوت کیا اور پاس بیٹھ گیا۔ بھیڑ نے اشیرباد دی۔ اور نہایت مسکین سی شکل بنا کر اپدیش دینا شروع کیا کہ بابا! یہ دنیا چند روزہ ہے۔ مایا کا جال ہے۔ یہ خونریزی اور گوشت خوری کی زندگی بھلے مانسوں کا کام نہیں دشمن سے پریم کرو۔ اپنے آپ کو مارو۔ آتما کی شانتی اس سے حاصل ہو گی۔

ایکہ می نازی بذبحِ گوسفند + 　　ذبح کن خود راکہ باشی ارجمند
زندگی رامی کند نا پائدار + 　　جبر و قہر و انتقام و اقتدار
غافل از خود شو اگر فرزانۂ 　　گر ز خود غافل نہ دیوانۂ
چشم بند و گوش بند و لب ببند 　　تا رسد فکر تو بر چرخِ بلند

گوسفند کی یہ خواب آور فسوں سازی کارگر ہوگئی۔ اور شیر اس کا چیلہ بنگیا۔ اب بھائی کی جگہ اہمسا کا فلسفہ اس کی زندگی کا طرزِ عمل تھا۔ گوشت چھوڑ کر گھاس پات پر گذران [illegible] وہ تندی و تیزی، وہ جلال و جبروت مسکینی و عاجزی۔ [illegible] رفتہ رفتہ یہ حالت ہوگئی کہ:۔

از علف آں تیزیٔ دنداں نماند 　　ہیبتِ چشمِ شرر افشاں نماند
دل بتدریج از میانِ سینہ رفت 　　جوہرِ آئینہ از آئینہ رفت
آں جنونِ کوششِ کامل نماند 　　آں تقاضائے عمل در دل نماند
اقتدار و عزم و استقلال رفت 　　اعتبار و عزت و اقبال رفت
پنجہ ہائے آہنی بے زور شد + 　　مُردہ شد دلہا و تنہا گور شد
صد مرض پیدا شد از بے ہمتی + 　　کوتہ دستی۔ بیدلی۔ دوں فطرتی +

نتیجہ یہ کہ :۔ شیرِ بیدار از فسونِ میش خفت۔
اور قیامت یہ کہ :۔ انحطاطِ خویش را تہذیب گفت

ناصحانِ مشفق۔

یہ گوسفندی ناصحانِ مشفق پہلے پادریوں کی صورت میں جلوہ فرما ہوا کرتے تھے۔ انگلستان سے چلتے تو اپنے اسلحہ بنانے والے کارخانوں کو تاکید کر آتے کہ دیکھنا تمہاری بھٹیاں کہیں ٹھنڈی نہ پڑ جائیں سولہ سولہ انچ دہانے کی توپیں۔ چار چار من کے گولے۔ ڈھلتے چلے جائیں لیکن مشرق میں مسلمانوں کو "مسیح کی منادی" سنائی جاتی کہ خدا کی بادشاہت کمزوروں ناتوانوں اور ضعیفوں کا حصہ ہے

افیم کھاکر سور ہو تاکہ ملوکیت کے شکنجے اچھی طرح سے تم پر کسے جائیں وہ ان کو آسمانی بادشاہت کے خواب اور افسانے سناتے رہے حتیٰ کہ زمین کی بادشاہت یکسر دوسروں کے ہاتھ میں چلی گئی وہ دور ختم ہوا تو وہی بھیڑاب سادھو مہاتماؤں کے چولے ہیں مسلمانوں کے سامنے اہنسا کا پرچار کرنے لگی۔ ڈاکٹر مونجے ملٹری کالج کھول رہا ہے۔ بھائی پرمانند سنگھٹن کے اکھاڑے قائم کر رہا ہے۔ اور کوئی ان کو آتما گیان اہنسا کا ناٹک نہیں سناتا۔ لیکن مہاتما گاندھی کا نازک دل انگریزوں کے ظلم و ستم سے اس قدر متاثر ہوتا ہے کہ سرحد کے پٹھانوں کو اہنسا کا سبق دینے جاتے ہیں۔

شکایت ہے مجھے یارب خداوندان مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

پٹھان کا ہوا، بھارت ماتا کے سر پر جن کی طرح سوار تھا۔ اس کے دفعیہ کا یہی موثر طریقہ سمجھا گیا کہ اپنے ہاں ملٹری کالج کھولے جائیں اور وہاں کے "خان" کو "گاندھی" بنا کر ہاتھ باندھ کر ڈنڈوت کرنا سکھایا جائے۔ اور اس کے بعد جو جبری تعلیم رائج کی جائے۔ اس میں بچوں کے دلوں پر یہ نقش کیا جائے کہ اہنسا کا نظریۂ زندگی ہمیشہ ہنسا سے اچھا ہوتا ہے۔ یہی نہیں۔ ہنسا کی برائیاں اچھی طرح سے واضح کی جائیں اور تاریخ عالم سے ان مشاہیر کی کہانیاں پڑھائی جائیں جنہوں نے اہنسا کے ذریعے سے دنیا میں امن حاصل کیا ہے۔ یعنی مہاتما بدھ کی سوانح حیات اجاگر کر کے دکھائی جائے اور محمد الرسول اللہ کی زندگی (نعوذ باللہ) گھناؤنی بتائی جائے ہندوستانی غلاموں کا دستور حیات درخشندہ نظر آئے۔ اور عمرؓ و خالدؓ کا طرز عمل (خاکم بدہن) مردود قرار پا جائے۔ ذرا تصور میں لائیے۔ اس وقت کو کہ آپ کے بچے سات برس کی عمر سے چودہ برس کی عمر تک اس تعلیم کے لئے مجبور کئے جائیں جس کی رو سے نبی اکرمؐ سے لیکر شاہ اسمعیل شہیدؒ تک تمام مجاہدین اسلام کا فلسفۂ حیات نفرت انگیز ہو۔ اور اس کے برعکس ہندوستان کے تمام یوگی۔ سنیاسی اور ان کے سرخیل مہاتما گاندھی خدا کے اوتار سمجھے جائیں۔ غور فرمائیے کہ نتیجہ کیا ہوگا۔ ہندو کی تو سلطنت ہوگی اس لئے ان کے بچوں کو اہنسا پڑھائیے یا ہنسا۔ اس سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ بلکہ اہنسا سے

ان کے دلوں میں اپنے بزرگوں کی عزت۔ اپنے مذہب کی عظمت اور مسلمانوں کے مشاہیر سے نفرت اور ان کے مذہب سے حقارت کے جذبات پیدا ہونگے۔ لیکن غور فرمایئے کہ مسلمان بچوں کی ذہنی اور قلبی کیفیت کیا سے کیا بن جائے گی۔ مہاتماجی کس قدر معصومانہ انداز سے فرماتے ہیں کہ موجودہ انداز پر مذہبی تعلیم سے چونکہ اختلافات بڑھتے ہیں۔ اس لیئے مذہبی تعلیم کو واردھا اسکیم سے خارج کر دیا گیا ہے لیکن ان سے کوئی پوچھے کہ اہمسا کی خوبیاں اور ہمسا کی برائیاں بتانے سے کوئی اختلاف نہ پیدا ہوگا! اس "مہاتمیت" کے چہرے کو اُتار دیئے تو نیچے سے صاف نظر آجائے گا کہ مقصد اصل کیا ہے! مقصد یہ ہے کہ مذہب اسلام کی تعلیم جبراً روک دی جائے اور اسکے بجائے ہندومت کی تعلیم عام کر دی جائے۔

اعتراف حقیقت

تہا اہمسا اور اسلامی تعلیم میں اتنا کھلا ہوا فرق ہے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب پچھلے دنوں جب واردھا اسکیم کے سلسلہ میں شملہ تشریف لائے، تو انھوں نے اسکیم کے متعلق صندل ہال میں تقریر فرمائی۔ تقریر کے بعد ایک پرائیویٹ صحبت میں اُن سے اہمسا اور اسلامی فلسفہ حیات کے متعلق کچھ سوالات کیئے گئے تو انھوں نے دوہی قدم پر جاکر کھلے الفاظ میں اقرار کرلیا کہ فی الواقعہ یہ غلطی ہے۔ اسلام کا فلسفہ زندگی صرف اہمسا نہیں بلکہ ہمسا اور اہمسا دونوں کا امتزاج ہے۔ اب پتہ نہیں کہ جناب ڈاکٹر صاحب اس غلطی کا اعلان بھی فرماتے ہیں یا نہیں۔ لیکن ہم تو بالکل واضح الفاظ میں اعلان کر دینا چاہتے ہیں کہ اسلام نرمی اور انکساری کے ساتھ ساتھ سختی اور درشتی کا بھی مذہب ہے یہ جلالی اور جمالی کا مذہب ہے۔ یہ محبت اور قوت کا مذہب ہے۔ اشداء علی الکفار بھی اسی خدا کا حکم ہے۔ جس کا حکم رحماء بینھم ہے۔ فاقتلوھم حیث ثقفتموھم (فتنہ پردازوں کو جہاں پاؤ کچل دو) یہ بھی اسی خدا کا ارشاد ہے جس کا ارشاد فاعفوا واصفحوا (معاف کرو اور درگذری کرو) ہے۔ مسلمان کو حکم یہ ہے کہ

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہوجا

گذر جابن کے سیلِ تندرو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہوجا

یہ ہے وہ تعلیم جو ان بچوں کے شایان شان ہے۔ جو تیغوں کے سائے میں پل کر جوان ہوتے ہیں۔

نہ کہ اہمسا کی خود فریبی۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ ہندوستان میں مسلمان کی آج کیا حالت ہے ہمیں تو اس سے غرض ہے کہ وہ مذہب جسے مسلمان خدا کا سچا مذہب سمجھتا ہے اس کی تعلیم کیا ہے۔

اب ذرا سماج کے علم کے ان دو ٹکڑوں کو ملائیے

(۱) تمام مذاہب، اسلام اور ہندومت۔ اصولی طور پر یکساں ہیں کسی کو دوسرے پر تفوق نہیں۔

(۲) فلسفۂ زندگی کے اعتبار سے اہمسا کو ہمسا پر فضیلت ہے۔

فرمائیے نتیجہ کیا نکلا؟ اس پر اعلان پر اعلان ہو رہا ہے کہ یہ اسکیم مشترکہ تعلیم کی اسکیم ہے۔ اسے کسی مذہب کی تعلیم سے واسطہ نہیں۔ اللہ اکبر! کسقدر کھلا ہوا فریب!!

بنیادی نقش

سماج کے علم کی ایک اور شق میں تحریر ہے کہ تعلیم ایسی دی جائے جس سے بچے کے دل میں وطن کی محبت ہو۔ وہ ہندوستان کے پچھلے زمانہ کی عزت کرے۔ (رپورٹ ص۱۱)

بجا! مذہب کے اعتبار سے اسلام اور ہندومت یکساں

فلسفۂ زندگی کے اعتبار سے اہمسا کو ہمسا پر فوقیت

ہندو مذہب اور ہندو فلسفہ کا جس عہد میں زور تھا اس زمانے کی عزت بچے کے دل میں بٹھا دی جائے۔

اس طرح متحدہ قومیت کی تشکیل ہو گی۔ الگ الگ مذہب کی تعلیم چونکہ لڑائی جھگڑے کا موجب ہوتی ہے اس لئے اہمسا کے ودیا مندر میں اس کا گذر کیوں ہو۔ ان جھگڑوں کے مٹانے کا واحد علاج یہ ہے کہ تعلیم ایسی دی جائے جس کی رو سے ہندو فلسفۂ زندگی کی عظمت اور ہندو دور تہذیب کی عزت دلوں میں نقش ہو جائے۔ اسلام کے فلسفۂ زندگی کی مذمت اور اس فلسفہ کے علمبرداران

کی طرف سے دل میں نفرت پیدا ہو جائے جھگڑے خود بخود ٹٹ جائیں گے. جھگڑے تو اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب ہندو سمجھتا ہے کہ اسلام اور مسلمان صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کے لائق ہیں. اور مسلمان ایسا سن نہیں سکتا. لیکن جب ہندو اور مسلمان دونوں بچے اس باب میں متفق اللسان ہوں گے کہ ہاں واقعی اسلام کا فلسفۂ حیات اور اس کے علمبرداران انسانیت کے سب سے بڑے دشمن ہیں تو پھر جھگڑا کیسے پیدا ہوگا جب سر ہی نہ رہے گا تو سر درد کہاں ہوگا! یہ ہے وہ. انداز کی روشنی ، جو اس نوع انسانی کے مصلح اعظم کو براہ راست ، خدا ، کی طرف سے ملتی ہے جس کے دل میں تمام مذاہب کے پیروؤں کے لئے ، جذبۂ ہمدردی ، یکساں موجزن ہے. یہ اس ودیش کے مہاتما ہیں جہاں کے ہیرو ، کا سب سے بڑا کارنامہ یہ گنایا جاتا ہے کہ وہ جب افضل خاں سے صلح و محبت کا معانقہ کرنے کے لئے آگے بڑھا تو زیر آستین تیز نوکدار آہنی پنجہ چھپا رکھا تھا جو اس سے بغلگیر ہونے پر اس کے قلب و جگر میں پیوست کر دیا گیا. اس دیش کے مہاتما سے آپ کس قسم کے سلوک کی توقع رکھ سکتے ہیں. !

عاقبت گرگ زادہ گرگ شود گرچہ از آدمی بزرگ شود

جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے شملہ کی اس پرائیوٹ صحبت میں جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے فرمایا تھا کہ ، پچھلے زمانے ، سے ان کی مراد صرف ہندوؤں کا زمانہ ہی نہیں بلکہ اس میں مسلمانوں کا زمانہ بھی شامل ہے. لیکن جب یہ عرض کیا گیا کہ مسلمانوں کے زمانہ میں تو ہنسا کے علمبردار ہی نظر آئیں گے. اس زمانہ کی عزت بچے کے دل میں کیسے بٹھائی جائے گی. تو انہوں نے فرمایا کہ اس زمانہ کے صوفیائے کرام کے حالات بتائے جائیں گے جنہوں نے اہنسا کے مطابق زندگی بسر کی ہے.

ہم اس وقت اس بحث میں الجھنا نہیں چاہتے کہ وہ حضرات جن پر حقیقی معنوں میں. اولیاءاللہ کا لقب صادق ہوتا ہے ۔ وقت آنے پر وہ کس طرح تسبیح و مصلے کے ساتھ ساتھ شمشیر و سناں کو بھی

عین اسلام سمجھتے تھے۔ لیکن ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے اندر بھی خوبی صرف اسی چیز میں رہ گئی ہے جو ہندوؤں کے نظریۂ زندگی کے مطابق ہو۔ اسلام کا دوسرا حصہ یعنی مجاہدانہ حرارت کا شعبہ چونکہ اہمسا کے نظریہ کے مطابق نہیں ہے۔ اس لئے اس میں برائیاں ہی برائیاں ہیں۔ یہ ہے عملی تفسیر (یومنون ببعض الکتاب و یکفرون ببعض) کی۔ یعنی قرآن کے اتنے حصے پر ایمان جو اپنے نظریے کے مطابق ہو اور باقی حصہ سے انکار

باب سوم

زبان کا مسئلہ

اس کے بعد زبان کا مسئلہ آتا ہے۔ "ہندوستانی" زبان نصاب میں لازمی رکھی ہے (رپورٹ صفحہ ۱۳۳) زبان کا مسئلہ اس قدر اہم ہے کہ اسے ضمنی طور پر چھیڑا نہیں جا سکتا۔ یہ مضمون بہت طویل ہو رہا ہے۔ اس لئے ایسے اہم سوال پر ہم کسی دوسری صحبت میں مفصل بحث کریں گے (انشاء اللہ) اتنا یاد رہے کہ کسی قوم کی موت و حیات کا سوال اس قوم کی زبان اور اس کے رسم الخط کا وابستہ ہوتا ہے۔ مسلمان اس کی اہمیت سے ناواقف ہیں۔ اور ہندو چپکے ہی چپکے وہ سب کچھ کئے جا رہے ہیں کہ جب اس کے نتیجہ پر نگاہ پہونچتی ہے تو روح کانپ اٹھتی ہے کہ یا اللہ مستقبل قریب میں مسلمانوں پر بیا کیا کچھ گذرنے والا ہے۔ اس وقت تو اتنا دیکھئے کہ ہندوؤں کی اس تحریک کا اثر کہ ہندوستانی" زبان سے عربی و فارسی کے "غیر مانوس" الفاظ کو نکال دینا چاہیئے۔ کس قدر سرعت سے پھیلتا جا رہا ہے۔ رپورٹ زیر نظر میں انگریزی الفاظ تو جگہ جگہ آپ کو ملیں گے۔ مثلاً ٹریننگ، کورس، پالیسی، نارمل، ورکنگ وغیرہ۔ لیکن عربی اور فارسی کے ان الفاظ کی بجائے جنہیں سمجھنے میں کسی اردو دان کو بھی دقت نہیں ہو سکتی۔ ایسے الفاظ ٹھونسے گئے ہیں جنہیں

نہ عبادت کی روانی قبول کرتی ہے نہ مذاق سلیم۔ جبکہ بعض الفاظ بجائے خویش ایسے غیر مانوس ہیں کہ اردو دان طبقے نے شاید ہی کبھی سنے ہوں۔ مثلاً۔ نئی سماج کا ڈول ڈالے جس کی نیو انسانی ہمدردی پر رکھی گئی ہو۔ پچھم کے ملکوں میں کسی سفید سیوا کے ذریعے۔ دھیرے دھیرے اتنی مشق ہو جائے۔ جس کی نیو۔۔۔۔۔ نیا دُپر رکھی جائے۔۔ وغیرہ۔ کہیئے کہ طرح ڈالنا، بنیاد مغرب، خدمت، آہستہ آہستہ، انصاف ان میں سے کونسا لفظ ایسا ہے جو عام فہم نہیں۔ ان کی جگہ خواہ مخواہ پوربیوں کی بولی گھسیٹنا اس بات کی کھلی کھلی غمازی کر رہا ہے کہ ہر بات میں ہندوؤں کی خوشنودی کا جذبہ کس قدر غالب آرہا ہے۔ یہ اگر مرعوبیت نہیں تو اور کیا ہے؟

⁂

باب چہارم

(معاشرت)

اب مقطع کا بند سنیئے ارشاد ہے

"گانا۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ بچوں کو اچھے گیت یاد ہو جائیں اور انہیں اچھے گانے کی پہچان اور شوق ہو جائے۔ بچوں میں تال کا جو قدرتی احساس ہوتا ہے اسے ترقی دینے کے لئے انہیں دونوں ہاتھوں سے تالی دینا سکھایا جائے (۱۲۳)"

آپ کو معلوم ہے کہ اچھے برے گانے کی پہچان کے لئے کس قدر راگ ودیا کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور پھر سر تال سے سیکھنے کے لئے اور کیا کچھ سیکھنا پڑتا ہے۔ رقص و سرود ہندوؤں کی پراچین تہذیب کا ایک ضروری جزو ہے۔ ڈاکٹر ٹیگور کو آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہ بایں ہمہ پیرانہ سالی نوجوان لڑکیوں کو ساتھ لیکر شہر شہر ناچ اور گانے کا تماشا دکھاتے پھرتے تھے۔ ادھر شنکر اور اس کی پارٹی رقص و سرود کے ذریعے "کرشن لیلا" کی یاد تازہ کرتے پھرتے ہیں۔ ہندو کنیا مہا ودیالوں میں راگ وغیرہ نصاب میں داخل ہے۔ لہذا اگر ہندو لڑکے اور لڑکیوں کے لئے راگ

کا نصاب رکھا جائے تو انہیں عین مسرت ہوگی لیکن سوال یہ ہے کہ چودہ برس کی عمر میں مسلمان لڑکیوں کو راگ اور تال سکھا کر کیا بنانا مقصود ہے! حضرت اکبر مرحوم نے فرمایا تھا کہ

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر — خاتون خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں
دین دار متقی ہوں جو ہوں ان کے منتظم — استاد اچھے ہوں مگر استاد جی نہ ہوں

مسلمانو! ذرا غور سے دیکھو کہ آزاد ہندوستان میں جبری تعلیم کی رو سے آپ کی بیٹیاں اور بہنیں کس قسم کی تعلیم حاصل کیا کریں گی

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

٭

نتائج مستخرجہ

علتِ مرض

یہ ہے مختصراً وار دھا سکیم جو مہاتما گاندھی کے حجلۂ دماغ سے نکل کر جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کی مساعی جمیلہ کے صدقے مسلمانوں کے بچے اور بچیوں کے لئے جبری تعلیم کا نصاب بننے والی ہے شملہ میں اسکیم پر آخری مرتبہ غور و خوض ہو چکا ہے۔ اور اس کے بعد یہ نافذ العمل ہو جائے گی۔ مسلمانوں نے دیگر اہم مسائل کی طرح تعلیمی مسائل میں بھی ہمیشہ بے رخی برتی ہے جس کا نتیجہ ان کے سامنے ہے۔ لیکن وہ یاد رکھیں کہ اگر انہوں نے اس مرتبہ بھی ایسا ہی کیا تو پچاس برس کے اندر وہ دیکھیں گے کہ ان کا ہندوستان میں بھی وہی حشر ہوگا جو اسپین میں ہوا تھا۔ اور پھر یہ ڈھونڈیں گے کہ وہ قوم کیا ہوئی جو اپنے آپ کو مسلمان کہا کرتی تھی۔ لیکن یہ سب باتیں فروعی ہیں۔ اصل نقص کہیں اور ہے۔ یہ تو یوں سمجھئے کہ یہاں پھوڑا نکل آیا۔ وہاں پھنسی ہوگئی۔ کہیں خارش نمودار ہوگئی کہیں چنبل پھوٹ نکلا۔ یہ امراض نہیں ہیں یہ علامات مرض ہیں

ہیں۔ علت مرض یہ ہے کہ خون خراب ہوچکا ہے ان پھوڑے پھنسیوں کا علاج مرہم سے نہیں ہوگا۔ خون صاف کر دینے سے ہوگا۔ یہ واردھا اسکیم، یہ مخلوط و جداگانہ طریق انتخاب یہ ہندی اردو کے جھگڑے۔ سب علامات مرض ہیں۔ اصل مرض یہ ہے کہ ہندو ہندوستان میں ایک متحدہ قومیت بنانا چاہتے ہیں۔ تاکہ مسلمان اپنی ملی خصوصیات کھو کر کان نمک میں پہنچکر نمک بن جائیں۔ جب تک آپ اس بنیادی اصول کو پاش پاش کر کے نہ رکھدیں گے آپ کے کسی مرض کا علاج نہیں ہوسکتا۔ مسلمان ہندوستان میں ایک الگ قوم کی حیثیت سے رہیگا۔ اس کی الگ جماعتی زندگی ہوگی۔ اور جب قوم الگ ہوگی تو پھر اس کی زبان بھی اپنی ہوگی۔ تہذیب بھی الگ ہوگی، مذہب بھی الگ ہوگا اور تعلیم بھی الگ ہوگی۔ نہ ان کی مشترکہ قومیت ہوسکتی ہے۔ اور نہ مشترکہ تعلیم۔ ہندوؤں سے کہئے کہ وہ اپنے بچوں کیلئے تعلیمی اسکیمیں تیار کرتے رہیں۔ انہیں کیا حق حاصل ہے کہ مسلمانوں کے بچوں کیلئے تعلیمی تجاویز سوچتے پھریں۔ اور پھر ان پر انہیں جبراً عائد کردیں۔ اور اس طرح جو کام سوامی شردھانند نے اٹھایا تھا پروہ پروان نہ چڑھ سکا اسے مہاتما گاندھی پورا کر دیں۔

ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

ہمیں یقین ہے کہ مسلمانوں کے لئے جو مہلک اثرات اس اسکیم کے اندر چھپا کر رکھے گئے ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کی نگاہوں کے سامنے وہ بے نقاب ہوکر نہیں آئے اور انہوں نے اس کو محض سطحی اور عمومی نظر سے دیکھا ہے ورنہ یہ باور کرنے کو جی ہی نہیں چاہتا کہ جناب ڈاکٹر صاحب دیدہ و دانستہ ہندوؤں کی چھری سے یوں مسلمانوں کے بچوں کو اپنے ہاتھوں سے ذبح کرنے پر تلے بیٹھے ہوں۔ خدا کرے کہ اس اسکیم کے ساتھ انکی تائید غلط فہمی پر مبنی ہو۔ اور جسطرح انہوں نے شملہ میں اس مسئلے کے متعلق اپنی غلطی کو تسلیم کیا تھا۔ اسیطرح وہ باقی اسکیم کے متعلق تفصیلات بالا کی روشنی میں غور فرما کر اس سے اپنی برأت کا اعلان فرمادیں ورنہ یہ ظاہر ہے کہ اس اسکیم کا ان کے نام سے انتساب ملت اسلامیہ کا قتل نہیں تو اعانت قتل کے جرم سے انہیں کبھی بری نہیں قرار دے سکیگا۔

۹ (تکملہ) یہ مضمون پریس میں جا چکا تھا کہ مہاتما گاندھی کا ذیل کا بیان اخبارات میں شائع ہوا

"مختلف طبقات و مذاہب کے بچوں میں رواداری اور دوستی کی جو روح پیدا ہو رہی ہے میں اس کے پیش نظر اس بات کو سخت مہلک اور خطرناک سمجھتا ہوں کہ ان کو یہ سکھایا جائے کہ ان کا مذہب دیگر تمام مذاہب پر برتری رکھتا ہے یا جس مذہب کے وہ قائل ہیں ان کے نزدیک بس وہی مذہب سچا ہے اگر یہ تفرقہ انگیز روح قوم میں سرایت کر گئی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر فرقہ کا علیحدہ اسکول ہو جس میں ایک کی مذمت کرنے کی پوری آزادی حاصل ہو یا پھر ایسی درسگاہوں میں مذہب کے تذکرہ کو بالکل ہی ممنوع قرار دیا جائے" (اسٹیٹسمین ۱۷ جولائی ۱۹۳۸ء صفحہ کالم ۲)

(نیز ہندوستان ٹائمز ۱۷ جولائی ۱۹۳۸ء)

دیکھ لیجئے جس چیز کیطرف ہم نے اپنے مضمون میں اشارہ کیا تھا وہ لفظاً لفظاً سامنے آگئی یا نہیں! اور ابھی آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا! جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں مہاتما گاندھی کا مسلک شیر کا مسلک نہیں جو بے نقاب گرجتا پھرتا سامنے آجائے۔ بلکہ ان کا مسلک ہمیشہ گھات میں رہنے کا ہے۔ اور مسلمانوں کی تباہی کے معاملات میں تو وہ خاص طور شاطرانہ چالوں سے کام لیتے ہیں۔

پھر یہ بھی دیکھ لیجئے کہ جو کچھ مہاتما جی چاہتے ہیں وہ لفظاً لفظاً وہی ہے جو مولانا آزاد نے اپنی تفسیر میں پہلے ہی سے لکھ رکھا ہے اور اس طرح مہاتما گاندھی کے مقصد کے حصول کے لئے پہلے ہی سے زمین تیار کر چھوڑی ہے۔

اندازہ فرمایئے کہ جب مسلمان بچوں کو یہ سمجھا دیا جائیگا کہ دیگر مذاہب بھی اسلام کی طرح سچے اور خدائی مذاہب ہیں تو پھر اسلامی قوانین کی حفاظت، اسلامی تمدّن و تہذیب کی حفاظت اور اسلامی حقوق کی حفاظت کا سوال ہی پیدا نہ ہوگا اگر صحابہ کرامؓ کو مذہب کا یہ فلسفہ معلوم ہوتا اگر خالد بن ولیدؓ، عمرو بن العاص اور سلطان صلاح الدین کو اپنے زمانہ میں کوئی گاندھی مل جاتا تو آج اسلام کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔ یعنی سرے سے اسلام کا وجود ہی نہ ہوتا اور مسلمان بہت جلد اس کیمیاوی عمل سے تحلیل ہو کر فنا ہو جاتا۔ لیکن مہاتما گاندھی یا اور ہندوؤں کا کیا گلہ۔ انھوں نے تو مسلمانوں سے انتقام لینا ہے اور اسکے لیئے وہ ہر حربہ استعمال کریں گے۔ رونا تو آتا ہے ان مسلمان اکابر پر جو

۹ بزرجوان سے ان دو مقاصد کے حصول میں اس قدر بڑھا چڑھا عشق میں مصروف ہیں – از باغبان شرارت کر رہا ہوں نذر کرد

رفتار زمانہ

عالم اسلام

ترکی

مصطفٰے کمال پاشا نے مجلس ملی کبیر کے اجلاس میں جنگی مہمات پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک اسلامیت نواز اور ولولہ انگیز تقریر فرمائی۔ آپ نے فرمایا کہ سچا ترک مسلمان وہ ہے جو خدائے واحد پر بھروسہ رکھتا ہے اور اپنی زبان کو باری تعالٰی کی امانت سمجھتا ہے۔ ہمیں خدائے قدیر پر بھروسہ ہے اور جو شخص اس پر بھروسہ رکھتا ہے اس کو دنیا کی کوئی طاقت بھی مغلوب نہیں کر سکتی۔ ہم آزاد رہنا چاہتے ہیں اور ہماری سب سے بڑی خواہش یہی ہے کہ دنیا کی تمام قومیں آزاد رہیں۔ ہم نہ خود غلام بننا چاہتے ہیں اور نہ کسی دوسری قوم کو غلام بنانا چاہتے ہیں۔ کیونکہ انسان انسانوں کو غلام بنانے کیلئے پیدا نہیں ہوا بلکہ غلاموں کو آزاد کرنے اور مظلوموں کی حمایت کرنے کیلئے پیدا ہوا ہے۔

مجلس کبیر میں اس تقریر کا خاص اثر محسوس کیا گیا اور غازی کمال پاشا کو ہر طرف سے چیرز دیئے گئے۔ کاش تلافی مافات کیلئے غازی موصوف نے ایسا ہی فرمایا ہو اور یہ خبر سچی ہو۔ کمال پاشا آجکل نئی نئی اسکیمیں سوچ رہے ہیں اور ہر اعتبار سے اپنے ملک کو کامیاب بنانے کی کوشش فرما رہے ہیں۔ ترکی حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ انگورہ کو بحر اسود سے ملانے کیلئے ایک نہر کھود دی جائے۔ اس نہر کی تیاری میں نہر سقاریہ کی موجودگی سے زبردست فائدہ اٹھایا جائے گا۔ یہ نہر بحر سیاہ میں گرتی ہے۔ ترکی پبلک نے نہایت گرمجوشی کے ساتھ اس تجویز کی حمایت کی ہے۔

برطانی ترکی گفت و شنید کے اختتام پر لندن میں تین معاہدوں پر دستخط ہوئے۔ معاہدۂ اول کی رو سے ترکی کیلئے ایک کروڑ پونڈ کا قرضہ منظور کیا گیا ہے۔ معاہدہ دوم کی رو سے معاہدہ تجارت

میں اضافہ منظور کیا گیا ہے اور معاہدہ سوم کا منشا یہ ہے کہ ترکی حکومت برطانیہ کلاں سے جنگی جہاز اور دیگر سامان حرب منگوا سکتا ہے اس معاہدہ پر ہر طرف سے چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں. بالخصوص جرمنی کو اس قرضہ پر سخت ملال ہے. جرمنی کا دلی منشا تو یہ تھا کہ ترکی حکومت اس سے قرضہ لیتی اور برطانیہ سے میل جول نہ بڑھاتی کیونکہ یہ اتحاد خود جرمنی کیلئے مضر رساں ہے. مگر یورپ کی فضا کے پیش نظر ترکی نے برطانیہ سے اتحاد قائم کرلیا ہے جو ان حکومتوں کی نظر میں پسندیدہ نہیں جو برطانیہ کی چالوں سے واقف ہیں یا جن کو اس اتحاد سے نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہے.

مصر

یہ اطلاع معتبر ہے کہ شاہ فاروق والئی مصر اپنی ہمشیرہ فوزیہ کی تقریب نکاح میں شرکت کیلئے ایران تشریف لیجائیں گے. انہوں نے بعض سلاطین کو اور بعض مشرقی زعماء کو اس تقریب میں شرکت کی دعوت بھی دی ہے. شاہزادی فوزیہ کا عقد شاہزادہ ایران سے موسم سرما میں منعقد ہوگا. اور اس طرح روحانی رشتہ کے ساتھ جسمانی رشتہ بھی مصر اور ایران میں مستحکم ہو جائے گا. جو لوگ مصر اور ایران کے سیاسی ابھار کا تجربہ رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ جسمانی تعلق دولتین کے لئے کس قدر اہم اور نتیجہ خیز ہے چنانچہ یورپ میں ابھی سے اس پر قیاس آرائیاں کی جارہی ہیں اور برطانیہ کو اکسایا جارہا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح اس تقریب میں کھنڈت ڈالدے. مگر خیال ہے کہ برطانیہ اس معاملہ میں کھلے بندوں مداخلت نہ کریگی.

حجاز

حکومت حجاز نے ایک نہایت ہی مفید کام انجام دینے کیلئے اسکیم بنائی ہے یعنی حج کے موقعہ پر جن لاکھوں مویشیوں کا خون رائگاں چلا جاتا ہے اور اس سے بیماریاں پھیلتی ہیں اب اس کو جمع کرکے فروخت کیا جائے گا. اور رنگ بنانے والے کارخانوں کو یہ خون ہر سال فراہم کیا جائے گا نیز کھالوں کی فروخت کا بھی انتظام کیا گیا ہے تاکہ حکومت کو اقتصادی فوائد بھی حاصل ہوں اور سرزمین مقدس بیماریوں سے بھی محفوظ رہے.

فلسطین

فلسطین کے حالات بدستور ہیں بلکہ روز بروز اور زیادہ خراب ہوتے جارہے ہیں۔ ہر جگہ کرفیو آرڈر کا نفاذ ہے مصر اور انگلستان سے دھڑادھڑ فوجیں چلی آرہی ہیں۔ عربوں کو گولی سے اڑایا جارہا ہے۔ محاکم شرعیہ معطل کردیئے گئے ہیں اور علماء کو گرفتار کیا جارہا ہے فلسطین کی فوجی عدالت عربوں کو پھانسی کا حکم بھی دے رہی ہے۔ چنانچہ جولائی میں کئی درجن عرب تختہ دار پر لٹکائے جاچکے ہیں۔ فلسطین میں کوئی دن ایسا جاتا ہوگا جس میں بم نہ پھینکا جاتا ہوگا۔ اور جس سے عرب یا یہودی ہلاک نہ ہوتے ہوں گے۔ ۷/ جولائی کو صرف ایک روز میں عربوں اور فوجوں کے درمیان تصادم میں ۲۱ عرب شہید اور ۶ یہودی ہلاک ہوگئے زخمی عربوں کی تعداد ۹۲ تک پہونچ گئی۔ ڈاکٹر وزمین جو دنیائے یہود کے سب سے بڑے لیڈر ہیں ان کا سالا اس جنگ میں گولی سے مارا گیا۔

بیت المقدس میں مسجد عشمر کے اندر ایک واعظ کو نماز پڑھتے ہوئے گولی سے شہید کردیا گیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں یہودیوں کے حوصلے کس قدر بڑھ گئے ہیں اور برطانیہ کی فتنہ سامانیوں سے مسلمانوں کے مقدس ترین مقامات کا کیا حشر ہونے والا ہے

فلسطین میں عربوں پر مظالم کے خلاف مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی اور علامہ مفتی محمد کفایت اللہ صاحب نے ایک بیان شائع کیا ہے جس میں فرماتے ہیں کہ مسجد اقصیٰ میں یتیموں بیواؤں کے گریہ و بکا اور نالہ و شیون کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں اور عالم اسلام کا جگر خون ہو رہا ہے غیرت الٰہی کو جوش آنے والا ہے ظالموں کو انتقام کی بطش شدید سے نجات نہیں ملے گی۔ مسلمانو! اٹھو اور برطانیہ کو بتادو کہ عربوں پر برطانوی مظالم نے عربوں کے دلوں کا خون کردیا ہے۔ اعراب فلسطین کے مطالبات جائز۔ ان کے جذبات آزادی صحیح اور ان کی جدوجہد حق پر مبنی ہے برطانیہ کو چاہیئے کہ وہ ان کے سروں پر یہودیوں کو مسلط نہ کرے۔ ورنہ عربوں کی غیرت و شجاعت ان کے خون کا آخری قطرہ تک بہادینے پر مجبور کرے گی۔ اور وہ مظلومیت کی موت کو ذلت کی زندگی پر ترجیح دیں گے۔

لندن میں پنڈت جواہر لال نہرو سابق صدر کانگریس نے ایک تقریر کے دوران میں کہا کہ امن اور سامراجی حکومت ایک دوسرے سے کلی تضاد رکھتی ہیں. فلسطین میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سامراج ہی کا صدقہ ہے. ہمیں ان یہودیوں سے ہمدردی ہے جن کو دیگر ممالک سے نکالا جا رہا ہے. لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ فلسطین کی جنگ عرب کی آزادی کے لئے ہے. نہ کہ یہودیوں کو تباہ کرنے کیلئے.

معلوم ہوا ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو یورپ کی سیاحت سے سیر ہو کر ترکی اور فلسطین جاکر حالات کا بچشم خود معائنہ کریں گے.

غیر ممالک

لندن

آجکل لندن میں کانگریس کے سابق صدر پنڈت جواہر لال گرج رہے ہیں انہوں نے خاص لندن میں اتنی تقریریں کی ہیں کہ شاید آجتک کسی ہندوستانی نے نہیں کی ہوں گی. جن جلسوں میں تقریریں کرتے ہیں ان میں پارلیمنٹ کے ممبر، بڑے بڑے لارڈ، آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر اور اخبار نویس شریک ہوتے ہیں اور نہایت ذوق وشوق سے تقریریں سنتے ہیں. پنڈت جی نے اپنی متعدد تقریروں میں فیڈریشن کی مخالفت کی اور بتایا کہ ہندوستان نمائندہ اسمبلی کے بغیر کسی حالت میں بھی مطمئن نہیں ہو سکتا. چونکہ آپ کی تقریروں کا عوام پر خاص اثر ہوا اس لئے اس کو زائل کرنے کیلئے لارڈ ولنگڈن نے مخالفت شروع کر دی. انہوں نے فرمایا کہ جس طرح ہندوستانی صوبوں میں انڈیا ایکٹ پر عمل ہو رہا ہے اسی طرح ہندوستان فیڈریشن کو بھی قبول کر لے گا. آپ نے یہ بھی کہا کہ پنڈت نہرو یہاں جو کچھ بھی فرما رہے ہیں وہ ان کی قوم کے نوے فی صدی باشندوں کی خواہش کے خلاف ہے. ان لوگوں کو پورا یقین ہے کہ ہندوستان کو ایک عرصہ دراز تک برطانیہ کی ضرورت رہے گی.

پنڈت نہرو نے ہندوستانی طلباء کے ایک جلسہ میں شرکت فرما کر اردو میں تقریر کی اور مجلس کے

خزانچی کی اس تجویز کی تائید کرتے ہوئے کہ ہندوستانی طلباء انگلستان میں ہندوستانی کے ذریعہ ہی تقریریں کریں گے. فرمایا کہ ہندوستانی ہی ایک ایسی زبان ہے جو دنیا میں تیسرے درجہ پر ہے اور صوبائی مشکلات کو دور کر سکتی ہے.

برطانی پارلیمنٹ میں سکریٹری آف اسٹیٹ سے دریافت کیا گیا کہ کیا حکومت فیڈریشن میں ترمیم کرنے کیلئے تیار ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ برطانیہ فیڈریشن میں کوئی ترمیم نہیں کرے گی اس کے مقابلہ میں کانگریس اس کو مسترد کرنے کا اعلان کر چکی ہے. دیکھئے اس جنگ میں فتح کس کو حاصل ہوتی ہے. اس بارے میں مسٹر ستیہ مورتی کے خیالات ہندوستان کے ذیل میں ملاحظہ کیجئے

چین

چین میں جاپان کے جارحانہ اقدام بدستور جاری ہیں اور جنگ کا سلسلہ بھی قائم ہے. اگرچہ مجموعی حیثیت سے جاپان نے چین کو سخت نقصان پہنچایا ہے تاہم چینی فوج کے افسر بد دل اور شکستہ خاطر نہیں ہیں بلکہ پختہ عزم کے ساتھ وہ برابر جاپان کا مقابلہ کر رہے ہیں.

۷ر جولائی کو چین اور جاپان کی جنگ کی برسی تھی اس موقعہ پر جنرل چیانگ کائی شیک نے چینی قوم کو حسب ذیل پیغام دیا ہے.

ہم آخر تک لڑتے رہیں گے خواہ ہمارے ملک کی ایک انچ ہی زمین بچے اور اس کی حفاظت کیلئے ایک ہی چینی زندہ رہے. کچھ ہو ہمارا عزم پائدار ہے. اسی روز شنگھائی کے بین الاقوامی علاقے میں متعدد مقامات پر بم گرائے گئے. جس کے باعث جگہ جگہ پہرہ لگا دیا گیا ہے

لندن کی چینی ایسوسی ایشن نے جواہر لال کے اعزاز میں لنچ دیا. جواہر لال نہرو کا استقبال کرتے ہوئے صدر نے کہا. ہندوستانیوں کا ایک بڑا لیڈر اور مظلوم چین کا ایک بڑا دوست " جواب میں پنڈت جی نے ہندوستان اور چین کے تہذیبی ربط کا ذکر کیا اور کہا کہ یورپ کی چودھرائی ختم ہو رہی ہے اور بین الاقوامی معاملات کے مرکز روز بروز ایشیا اور امریکہ بنتے جا رہے ہیں.

سپین

جولائی میں باغی صرف معمولی دیہات پر قابض ہوئے اور باقی حالات بدستور ہیں۔ اسپین کی جمہوری حکومت رسد کے معاملہ پر غور کر رہی ہے۔ میڈرڈ میں روزانہ فی کس ۱۵۰ گرام غذا اور ہفتہ میں دو بار ۱۰۰ گرام گوشت دیئے جانے کا مسئلہ زیر غور ہے، باغیوں نے بندرگاہ بریانا پر قبضہ کرلیا ہے ان کا دعوی ہے کہ انہوں نے ۲ ہزار جمہوری سپاہ کو گھیر لیا ہے اب وہ گنٹو سے دس میل کے فاصلے پر ہیں اس کے بعد ولنشیا پر کوئی اہم مقام نہیں ہے۔ ۱۲ ماہ کے بحث و مباحثہ کے بعد جولائی میں عدم مداخلت کمیٹی نے اسپین سے غیر ملکی رضاکاروں کے ہٹانے کی اسکیم اختیار کرلی خیال ہے کہ مالی مشکلات کے باعث سمندری راستوں کی دیکھ بھال نہیں کیجا سکے گی۔ لیکن خشکی کے راستوں کی دیکھ بھال فوراً شروع کردی جائے گی۔

برطانیہ کے اخبار منچسٹر گارجین نے اس اسکیم کو یکطرفہ بتایا ہے۔ کیونکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ فرانس اور اسپین کے درمیان کا راستہ بند ہوجائے تاکہ جمہوریہ اسپین کو کہیں سے مدد نہ مل سکے اس کے مقابلہ میں جنرل فرانکو کے بندرگاہوں میں اٹلی کے سامان جنگ کو روکنے کیلئے کوئی تدبیر نہیں کی گئی اس کے علاوہ ہوائی جہازوں کو جو سب سے زیادہ خطرناک اسلحہ ہیں بالکل ہی نظرانداز کردیا گیا ہے۔

ہندوستان

مدراس

مدراس میں ہندی کے خلاف ایجی ٹیشن برابر جاری ہے۔ ستیہ گرہ برابر ہو رہا ہے۔ اور گرفتاریاں بھی برابر عمل میں آرہی ہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مدراسیوں نے ہندی کے خلاف ایک مستقل محاذ جنگ قائم کرلیا ہے اگر ستیہ گرہ برابر جاری رہی تو حکومت کو اپنی روش بہرحال تبدیل کرنی پڑے گی۔

سرحد فقیر اپی کی مصنوعی جنگ کو دبانے اور وزیرستان پر قبضہ کرنے کی مہم زور و شور سے

جاری ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ فقیر یا تو کوئی فرضی شخص ہے جس کو اپنے اغراض کیلئے ایجاد کیا گیا ہے یا پھر وہ کوئی ایسی پر اسرار ہستی ہے جس کے سبز قدم قبائل کے خاتمہ کا سبب بن رہے ہیں۔ حکومت گورہ فوج، مرہٹہ، راجپوت، اور بلوچ فوج قبائل کا قلع قمع کرنے میں شب و روز مصروف ہیں اور حکومت بمباری کرکے مجاہدین کو ہمیشہ کیلئے خاموش کرنا چاہتی ہے۔

ایک سرکاری اطلاع سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۵ جولائی کو فقیر ایپی کے غاروں والے علاقہ سے واپسی کے وقت کوئی نقصان نہیں ہوا۔ قبائل کی ایک ٹولی جو واپسی کے وقت تعاقب کررہی تھی گولہ باری کرکے منتشر کردی گئی۔ غاروں والے علاقے سے آٹے، چاولوں، چنوں، لکڑیوں کے ذخیرے نقدی رائفلیں بارود، گولوں کا ایک صندوق برطانی فوج کے قبضہ میں آئے۔ یہ سب چیزیں قبائلی لوگ بھاگتے ہوئے چھوڑ گئے۔ ان میں سے کچھ وہیں برباد کردی گئیں اور کچھ برطانی فوجیں اپنے ہمراہ لے آئیں۔ مال کے علاوہ قبائل کا جانی نقصان بھی بہت ہوا۔ اس علاقہ میں (بقول سرکاری بیان کے) دشمن کی تعداد بہت کم رہ گئی ہے اور جنوبی وزیرستان میں امن و امان قائم ہوگیا ہے۔

مولانا آزاد

شامی پیر جو افغانستان میں بغاوت کرنا چاہتا تھا اس کو حکومت نے گرفتار کرکے کسی نامعلوم مقام کو منتقل کردیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے شامی پیر کے متعلق حسب ذیل بیان دیا ہے۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے خاندان کے افراد بغداد میں رہتے ہیں لیکن اسی خاندان کی ایک شاخ عرصہ سے شام میں مقیم ہے۔ یہ خاندان دمشق میں سب سے زیادہ باعزت خیال کیا جاتا ہے سید محمد سعید جو وزیرستان میں شامی پیر کے نام سے مشہور ہوا اسی خاندان کا ایک فرد ہے یہ شخص شاہ امان اللہ کے خسر محمود طرزی کا رشتہ دار بھی بن گیا تھا۔ اور اسی بنا پر اس نے امان اللہ کے آخری دور میں افغانستان کا سفر کیا۔ کابل سے واپسی پر وہ کلکتہ آئے جہاں کابلی پٹھانوں نے ان کی مہمان نوازی کی۔ اس زمانہ میں مجھے ان کے متعلق معلوم ہوا اس وقت ان کی عمر ۲۴-۲۵ سال سے زائد نہ تھی۔ تین ہفتہ کے قیام کے بعد وہ اپنے وطن واپس چلے گئے۔ لیکن

اب معلوم ہوا کہ وہ ہندوستان آئے اور وزیرستان چلے گئے۔ اگر یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے موجودہ افغان گورنمنٹ کے خلاف کوئی تحریک شروع کی تھی۔ تو یہ چیز آسانی کے ساتھ سمجھ میں آسکتی ہے کہ اس کا پس منظر سابق شاہ امان اللہ خاں کی حمایت کا جذبہ تھا۔ مگر چونکہ نا اہل تھا اس لئے حکومت ہند کی ذراسی توجہ سے اس کو شام روانہ کر دیا گیا۔ اس وقت موجودہ حکومت کو بدلنے کی تحریک کرنا افغانستان کے حق میں کسی طرح مفید نہیں ہو سکتا۔

مسٹر ستیہ مورتی

کلکتہ کے اخبار امرت بازار پتریکا کے لندنی نامہ نگار نے ایک جلسہ کی اطلاع بھیجی تھی جس میں سر فریڈرک وائٹ نے تقریر کرتے ہوئے پنڈت جواہر لال کی لندن کی تقریروں کا حوالہ دیا اور کہا کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ایک با اثر ممبر سے باتیں کر کے وہ اور ہندوستان کے دوسرے ریٹائرڈ افسر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ کانگریس فیڈریشن کے معاملہ میں بھی ویسا ہی رویہ اختیار کرے گی جیسا کہ اس نے وزارتوں کے مسئلہ میں اختیار کیا ہے۔

اس پر صدر کانگریس سوبھاش بابو نے ایک بیان دیا ہے جس میں بتایا ہے کہ وہ کسی ثبوت کے بغیر یہ باور کرنے کیلئے تیار نہیں۔ کہ کانگریس کا کوئی با اثر لیڈر فیڈریشن کے معاملہ میں صلح کرنے کیلئے حکومت سے گفت و شنید کر رہا ہے۔ آپ نے بتایا ہے کہ صوبجاتی خود مختاری اور فیڈرل اسکیم میں کوئی مناسبت نہیں اس لئے وزارتیں تسلیم کرنے سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ فیڈریشن کو بھی قبول کر لیا جائے گا۔ اگر بدقسمتی سے یہ کوشش کامیاب ہوگئی تو کانگریس میں پھوٹ پڑ جائے گی کیونکہ جو لوگ برابر فیڈریشن کی حمایت کرتے رہے ہیں وہ اسکو خاموشی سے برداشت نہیں کریں گے۔
آپ نے مزید فرمایا کہ اگر کانگریس نے فیڈرل اسکیم منظور کر لی تو میرا فرض ہوگا کہ صدارت کے فرائض سے سبکدوش ہو جاؤں اور اس کی مخالفت پوری قوت کے ساتھ کروں۔

سوبھاش بابو کے اس بیان پر مسٹر ستیہ مورتی نے ایک بیان دیا ہے کہ کانگریس کو اس قسم کی دھمکی دینا صدر کانگریس کی شایان شان نہیں۔ اگر برطانیہ ہندوستان کی رائے عامہ کے دباؤ سے فیڈرل اسکیم میں عام تبدیلیاں کردے تو کوئی وجہ نہیں کہ فیڈریشن کو قبول نہ کیا جائے۔